معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۳ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۴ء عدد ۲

مضامین

شذرات

یہ بجا ہے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہو رہی ہے جس کا اعتراف انصاف پسند ہندوؤں کو بھی ہے مگر مسلمانوں نے اس ظلم و تعدی اور دوسروں کے ہاتھوں اپنی تباہی و بربادی کی شکایت کو اپنا شیوہ بنالیا ہے، ان کی مجلسوں میں گرمی اور انکے رہنماؤں کی تقریروں میں زور اسی سے پیدا ہوتا ہے، ادیب و شاعر اسی پر طبع آزمائی کر رہے ہیں، اخبار اور رسالے اس کے ذکر سے خالی نہیں رہتے، عام سامعین و قارئین بھی اسی کے عادی ہوگئے ہیں اور انکے لیے اس سے زیادہ دلچسپ اور دلپسند کوئی دوسرا موضوع نہیں ہوتا، ایسے ماحول میں اہم حقائق اور بنیادی امور پر کون غور و خوض کریگا اور سنجیدہ اور مفید باتوں کی جانب کسے توجہ ہوسکتی ہے، اس شکوہ و شکایت میں قوم کا اصل مفاد اور ملت کی تعمیر و ترقی کے مسائل بالکل نظر انداز ہوگئے ہیں اور لوگ بدتر حالات کو درست کرنے کی فکر کے بجائے ظلم و تعدی کرنے والوں کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ میں جلتے رہتے ہیں جس کو ان کے خطیب و صحافی اور قوم و ملت کے ناخدا اپنی سنسنی خیز اور اشتعال انگیز باتوں سے برابر ہوا دیتے رہتے ہیں۔

مسلمان کب تک اس فضا میں گھٹتے اور اپنی پریشانیوں کا دکھڑا بیان کرتے رہیں گے اور کبتک اسی میں اپنی قوت و توانائی اور اپنا قیمتی وقت برباد کرتے رہیں گے۔ کیا اس سے ان پر ہونے والے مظالم کی تلافی ہوسکتی ہے؟ یا اسی ایک موضوع میں خود بھی الجھے اور دوسروں کو الجھائے رکھنے سے قوم و ملت کی کوئی مفید خدمت انجام پاسکتی ہے؟ اس سے تو مسلمانوں کے مسائل اور زیادہ پیچیدہ ہوجائیں گے اور ظلم و جور پر آمادہ لوگوں کی شدت و تلخی میں مزید اضافہ ہوگا، کریدنے سے زخم مندمل نہیں ہوتا، اس لیے شکوہ و بدگمانی کے ماحول میں نہ مسلمانوں کے موجودہ حالات تبدیل ہوسکیں گے اور نہ انکی ابتلا و آزمائش کی گھڑیاں ختم ہوں گی، ان پر ہونے والے ظلم و تشدد کا

مداوا سوجھ بوجھ، حکمت، تدبر اور ضبط و تحمل ہی سے ہوسکتا ہے۔

ع مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

دراصل مسلمان حق و خیر کے داعی ہیں، ان کی زندگی ذمہ دار نظم دو عالم ہے، وہ خدا کی جانب سے خلق کی اصلاح و ہدایت پر مامور ہیں، حق کو فروغ دینا اور باطل کو معدوم کرنا ان کا فریضہ ہے، کفر و ضلالت کی تیرگی کو مٹانا اور رشد و ہدایت کے چراغ کو روشن کرنا ان کا کام ہے، باطل کی چمک دمک عارضی اور اس وقت تک ہوتی ہے جب تک حق او جھل رہتا ہے، دنیا میں ظلم و تشدد اور شر و فساد کا بول بالا اسی بنا پر ہوتا ہے کہ امن و انصاف اور صلاح و فلاح کی دعوت دینے والے مخفی و مستور ہوجاتے ہیں، مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے اپنے حسن عمل سے اپنے دشمنوں کو بھی اپنا ہمنوا اور گرویدہ بنالیا ہے اور اپنے حسن تدبیر سے وقت کے دھارے کو موڑ دیا ہے۔ اور اسے اپنے لیے سازگار بنالیا ہے۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے　　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اگر مسلمان اپنے درجہ و مرتبہ کو پہچان کر داعیانہ خصوصیات کے حامل بن جائیں اور اپنے وجود کو دنیا کے لیے موجبِ خیر و برکت بنادیں تو ان پر مظالم ڈھانے والے انکے لیے سراپا رحمت بن جائیں اور تشدد پر آمادہ لوگ ہی انکی حفاظت و پاسبانی کے ذمہ دار ہوجائیں۔

آج کی متمدن دنیا سے امن و آسایش اور سکون و راحت عنقا ہوگئی ہے، ہر شخص مضطرب اور پریشان دکھائی دیتا ہے، پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کا کیا ذکر؟ یورپ جسکا ہر قریہ فردوس کے مانند ہے، اسکے شبستان عشرت میں بھی کیف و انبساط مفقود ہوگیا ہے، وہاں کے علمائے نفسیات اس بے اطمینانی اور پریشانی کی وجہ دریافت کرنے میں لگے ہیں لیکن مسلمانوں کے صحیفہ ہدایت میں جابجا دل کی بیقراری و بے اطمینانی اور دنیا کی بدامنی و خلفشار کا علاج بیان ہوا ہے، اسکے نزدیک خدا پر ایمان ہی دلوں میں اطمینان و بے خوفی پیدا کرسکتا ہے، اسی سے قلوب کو اضطراب و تردد سے نجات مل سکتی ہے، نکتہ دانِ روم کے بقول ؎

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

قرآن مجید نے اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں واضح کیا ہے، ارشاد ربانی ہے "ہر مصیبت اللہ کے اذن سے آتی ہے اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اللہ اسکے دل کی رہنمائی کرتا ہے" (تغابن۔ ۶۴: ۱۱) یہ بھی فرمایا کہ "جو اپنے خداوند پر ایمان لائے گا اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی زیادتی کا" (جن۔ ۷۲: ۱۳) ایک جگہ ہے کہ "تسکینِ قلوب بس ذکر الٰہی سے ہوتی ہے" (رعد۔ ۱۳: ۲۸) ایک اور جگہ ہے "اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ دونوں گروہوں میں سے امن و اطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے؟ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن اور چین ہے اور وہی راہ یاب ہیں" (انعام۔ ۶: ۸۱-۸۲) ایک موقع پر ارشاد ہوا "بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے" (احقاف۔ ۴۶: ۱۳) دوسرے موقع پر فرمایا "جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے تقویٰ اختیار کیا، انکے لیے دنیا و آخرت میں بشارت ہے" (یونس۔ ۱۰: ۶۳-۶۴) ایک اور جگہ فرمایا کہ "جن بدبختوں کے قلوب ایمان و ذکر الٰہی سے خالی ہیں انکی زندگی ضیق میں گذرے گی" (طٰہٰ۔ ۲۰: ۱۲۴) یہ اور اس طرح کی متعدد آیتیں ایمان کی دنیوی برکات کے بارے میں نہایت واضح ہیں، انکے باوجود اگر مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری ہے اور وہ دوسروں کے ظلم و تعدی کے شاکی ہیں تو یہ انکی بے توفیقی اور ایمان کی دولت سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

رسالہ معارف کا پہلا نمبر رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ کے مقدس مہینہ میں شایع ہوا تھا اس لیے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بقول "مسلمانوں کے تمام علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب یعنی قرآن مجید اسی ماہ مقدس میں نازل ہوا تھا شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ"۔ یہ رسالہ جب قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا تو خیر و برکت کا یہی مہینہ انکے سروں پر سایہ افگن ہوگا، اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے معارف نے یہ طویل مسافت طے کی ہے اور انشاء اللہ آیندہ بھی اسکے فضل سے کریگا گو اس عرصہ میں ہر طرح کے سرد و گرم مواقع اور دلفریب و خوشنما جلوے سامنے آئے لیکن الحمد للہ معارف اپنی دیرینہ روش پر قائم رہا۔

ہر جلوہ مرا نتواند فریب داد پروانۂ چراغِ سرِ طور بودہ ایم

مقالات

ہندو مسلم تعلقات

چند بنیادی حقیقتیں[1]

از ڈاکٹر محمد خلیل عباس صدیقی۔ کلکتہ۔

ہندوستان کے دو عظیم فرقوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات نے بظاہر خاصی پیچیدہ صورت اختیار کر لی ہے۔ دونوں مذہبی گروہوں کے درمیان دیرینہ رشتوں، دیرپا روابط، بہت ساری مشترک قدروں، خوشگوار ہمسائیگی، باہمی تعاون اور رفاقت کی پرانی روایات میں بتدریج تبدیلی کا مسئلہ آج خاصا حساس ہوگیا ہے۔ ان رشتوں کو بحال کرنا اور دوبارہ پرانی ڈگر پر لانا کٹھن معلوم ہونے لگا ہے۔

دونوں فرقوں کے درمیان آپس کے تعلقات کا موضوع آج ایک سماجیات داں کے لیے جس قدر توجہ کا متقاضی ہے اسی قدر ہمارے وطن عزیز کی بقا اور خوش حالی کے لیے بھی اس کی اہمیت ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ایک طرف تو ہمیں امانت دارِ تہذیب کہن، ہونے کا فخر حاصل ہے تو دوسری طرف ہم اپنے روایتی سماجی اور سیاسی اداروں پر جدید رنگ و روغن کی قلعی کرنے اور قدامت کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف ہیں ایسی صورت میں یہ گمان غیر منطقی نہیں معلوم ہوتا کہ قدیم اور جدید کا یہ خاموش تصادم سماجی انتشار کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

---

[1] علامہ شبلی توسیعی خطبات کے تحت ۲۶ دسمبر ۱۹۹۳ء کو دار المصنفین میں یہ مقالہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک مجمع میں پڑھا گیا۔

لیکن بات اتنی سہل نہیں جتنی کہ معلوم ہوتی ہے اور مسئلے کا تجزیہ اور اس کے پس منظر سے واقفیت شاید اس کے حل میں معاون ہو۔

اس موضوع کی اہمیت کے باوجود سماجی سائنسدانوں نے اس کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کم وبیش مخصوص زاویۂ نظر کی نمائندگی کی گئی ہے، موجودہ رخ اختیار کرنے سے پیشتر ہندو مسلم تعلقات کا موضوع برطانوی عہد میں غیر ملکی حکمرانوں کے لیے دلچسپی کا باعث تھا، جتنا کچھ مواد اس پر موجود ہے اس کا معتدبہ حصہ برطانوی دانشوروں کی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ گو انھوں نے جس عرق ریزی سے کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن پُر از معلومات ہونے کے ساتھ برطانوی دانشوروں کی تصانیف سے نہ صرف ہماری بصارت رنگین ہوجاتی ہے بلکہ دونوں فرقوں کے تعلقات وہ خاص رخ اختیار کرلیتے ہیں جو برطانوی حکمرانوں کے مفاد کے مطابق اور خود ان دونوں فرقوں کے اپنے مفادات کے منافی ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ یہ روش نہ صرف ثابت وقائم ہے بلکہ آج کچھ دوسرے ہی مفادات کے زیر اثر اس میں روز افزوں ترقی بھی دکھائی دے رہی ہے۔

اس موضوع پر سب سے پہلے برطانوی عہد سے پیشتر کے وقائع نگاروں اور مورخوں کی تصانیف سے روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان میں مسلم حکمرانوں اور ہندو رعایا کے تعلقات پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی ہے۔ یہ تصانیف خصوصی مفادات کی ترجمانی سے زیادہ مصنفین کے مشاہدات اور تاثرات پر مبنی ہیں، ان کو نہ تو کسی منظم تحریک کے تحت مرتب کیا گیا تھا اور نہ ان میں دونوں فرقوں کے تعلقات کو کوئی خاص رخ دینے کی کوشش کی گئی تھی، اس لیے ہم یہاں انھیں زیر بحث نہیں لائیں گے۔

برطانوی دور میں ہندو مسلم تعلقات کے موضوع پر ہونے والی کوششوں پر ایک نظر

سماجی سائنسدانوں میں باضابطہ طور پر سب سے پہلے ہم نو آبادیاتی عہد کے برطانوی مورخین کو ہندو مسلم تعلقات کے موضوع سے دلچسپی لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں لٹریچر کی خاصی بڑی مقدار سامنے آئی۔ اس سے ہندو مسلم تعلقات کے موضوع پر بالواسطہ یا بلاواسطہ روشنی پڑتی ہے۔ برطانوی عہد کے مورخین میں جیمس مل JAMES MILL (1817) سر ہنری مین SIR HENRY MAIN (1866-67) سر ہنری ایلیٹ SIR HENRY ELIOT (1861) سر الیفرڈ لیال SIR ALFRED LYALL (1892) ایف ڈبلو تھامس F. W. THOMAS (1882) وغیرہ شامل ہیں، مورخین کے بعد سماجیات کے علما SOCIOLOGISTS اور سماجی انسانیات کے ماہرین SOCIAL ANTHROPOLOGISTS کے نام آتے ہیں۔ علمائے سیاسیات ونفسیات[1] نے بھی گاہے گاہے اس موضوع سے دلچسپی لی ہے لیکن وہ زیادہ اہم اور قابلِ لحاظ نہیں ہیں۔ البتہ گارڈنر مرفی کی کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں فرقوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں نہ صرف سماجی سائنس سے تعلق رکھنے والے علوم کے سب ہی شعبے متفق الرائے نہیں ہیں بلکہ کسی ایک شعبے کے مختلف دانشوروں کے درمیان بھی اتفاق رائے

[1] یونسکو کے سابق ڈائریکٹر گارڈنر مرفی کی کتاب IN THE MINDS OF MEN خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ تناؤ کے اسباب اور ان کے علاج پر بحث کی گئی ہے۔

بمشکل ہی دکھائی دے گا، حالانکہ علم کے یہ تمام شعبے سائنس کے دائرے میں شمار
کیے جاتے ہیں اس لیے توقع کی جاسکتی تھی کہ واقعاتی اور سماجیاتی پہلوؤں پر رائے زنی
کرنے کے لیے یہ سائنسی منہاج یا طریق تحقیق پر عمل پیرا ہوں گے بلکہ اپنے فن یا پیشے
کے بنیادی اصولوں جیسے بے غرض بابے لاگ مشاہدہ، کشادہ ذہنی، آفاقیت
(UNIVERSALISM) اور زیرِ مطالعہ لوگوں سے ہمدردی کے اوصاف سے متصف
ہوں گے۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔

کسی ایک شعبۂ علم کی ستائش اور دوسرے کی تنقیص کیے بغیر ہم اس تاثر میں
حق بجانب ہوں گے کہ عام طور پر دانشوروں نے اپنے مشاہدات میں حقیقت کے
کسی نہ کسی پہلو کو نظرانداز کیا ہے۔ اگر دانستہ طور پر ان کے مشاہدات بعض مخصوص
مفادات کے تابع نہ بھی ہوں تب بھی ان کی یہ فروگذاشت ان کے مشاہدے کو
جانبدار بنا دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ سب ہی صورتوں میں یہ جانبداری عمداً نہ ہو
اور فروگذاشت کا سبب انکے خصوصی شعبۂ علم کی کوتاہیاں ہوں۔

سوشل سائنس کے مختلف شعبوں کے بنیادی مناہج اور طریق تحقیق و تفتیش
پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ سماجی سائنس کا سب سے قدیم شعبہ یعنی تاریخ جس کے
مطالعے کے میدان میں انسان، اس کا معاشرہ، اس کی تہذیب اور ماضی و حال میں
اس کی تمام سرگرمیاں شامل ہیں۔ اس لیے ایک مورخ سے یہ بجا توقع ہوسکتی ہے
کہ وہ حقائق کے ثبوت مہیا کرے اور اسی کام کے لیے وہ حسب ذیل کو مدنظر رکھے۔
(۱) ضروری دستاویزات کی تلاش اور ان کا انکشاف کرنا (۲) انکی ناقدانہ
چھان پھٹک کرنا (۳) انکی تشریح و وضاحت کرنا (۴) ان کے باہمی تعلق پر گہری نظر

ڈالنا (۵) حقائق کے باہمی ربط اور ان کے تعامل کا تجزیہ کرنا۔ تاریخ نگاری
ایک فن ہے اس بنا پر ایک صاحب فن کی طرح ایک مورخ کے لیے اسلوب بیان
پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ اس کی تحریر قارئین کے لیے سہل اور دلکش ہو۔
(ملاحظہ کیجیے سرکار ۱۹۸۲ء صفحہ ۶۳)

سماجیات SOCIOLOGY کے مطالعے کا میدان عموماً وہ سماجی مسائل
ہیں جو بالخصوص پیچیدہ معاشروں[1] COMPLEX SOCIETIES سے متعلق
ہوں، سماجیاتی موہوب DATA عموماً دستاویزات، رکارڈ، مردم شماری اور
اعداد و شمار پر مشتمل ہوتے ہیں اور اس کے سانچے یا تو تحقیقاتی لوازم گوشواروں،
سوالناموں اور انٹرویو پر مبنی ہوتے ہیں۔ سماجیات دان عموماً مقدار یا اعداد
وشمار کے ذریعہ حقائق کا تجزیہ پیش کرتا ہے اور پیچیدہ COMPLEX
معاشرے کی ان تمام روشوں سے دلچسپی رکھتا ہے جو معمول کے مطابق ہوں یا
غیر معمولی ہوں۔

سماجی انسانیات SOCIAL ANTHROPOLOGY کے میدان میں روایتی
طور پر سادہ، قدیم، ناخواندہ معاشروں کا ایک سالم کی حیثیت سے مطالعہ شامل
ہے، تاہم اس میدان میں روزافزوں وسعت عمل میں آرہی ہے اور اب وہی

---

[1] سماجیاتی اصطلاح میں پیچیدہ معاشرہ ایسے معاشرے کو کہتے ہیں جو تقسیم کار کی بنیاد پر
قائم ہو اور اس میں مختلف طبقات ہوں۔ اس کے برعکس سیدھا سادہ یا SIMPLE معاشرہ
وہ ہوتا ہے جس کے افراد کم و بیش یک رنگ ہوں اور ان میں بڑے پیمانہ پر تقسیم کار کا چلن
نہ ہو۔

اور شہری یا بلدی معاشرے بھی اس کے دائرے میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ سماجی انسانیات کے علما روایتی طور پر فیلڈ ورک پر انحصار کرتے ہیں اور اپنے مطالعے کے نتائج اعداد و شمار کے بجائے ماہیتی QUALITATIVE شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ بیشتر ایسے حقائق سے دلچسپی رکھتے ہیں جو معاشرے کے معمولات PATTERNED NORMS میں شامل ہوں۔ لیکن حالیہ دور میں سوشیالوجی اور سوشل انتھراپالوجی کے میدانوں کا فرق جاتا رہا ہے۔ علم کے ان دونوں شعبوں کے تصورات، نظریات، ضابطے اور قوانین اس حد تک مشترک ہیں کہ اگر ہم سماجیات اور سماجی انسانیات کو ایک دوسرے کا متبادل تصور کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

گو سماجی علوم کے تمام شعبوں کے اندر تحقیقاتی منہاجیات RESEARCH METHO-DOLOGY کی تدریجی ترقی اور تفتیشی آلات کی افادیت و تاثر (اثر آفرینی) اب ثابت ہو چکی ہے۔ .... تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان تمام شعبوں کی دلچسپی کے موضوع یعنی انسانی معاشرے کو تحقیقات کے لیے طبیعی یا کیمیاوی علوم کی طرح کنٹرول میں نہیں لایا جا سکتا۔ انسانی علوم کی لیباریٹری بے حد وسیع ہے اور انسانی معاشرے کا مشاہدہ اور تجربہ ہم اس طرح نہیں کر سکتے جس طرح ایک طبیعیات داں یا کیمیاداں طبیعیاتی یا کیمیائی اشیاء کے متعلق کر سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماجی علوم کے اندر انسانی عنصر صریحاً نمایاں اور قطعاً ناگزیر ہے اور یہ حقیقت محض اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے تاریخ نگاری کی تاریخیں لکھی ہیں یہ (HISTORIAN OF HISTORIOGR-APHY) مورخوں کو کئی خانوں یا گروہوں جیسے یورو پی اور غیر یورو پی، ہندو اور

مسلم وغیرہ میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ایک ہی واقعے یا ایک ہی حقیقت کے مشاہدے، تجزیے اور تاویل میں ان مختلف اقسام کے مورخین کے درمیان فرق کی توقع کی جاتی ہے۔

ابن خلدون (۱۴۰۶ - ۱۳۳۲) نے آج سے صدیوں پیشتر اس امر کی طرف نشاندہی کی تھی کہ مورخ کے اندر پاسداری اور کورانہ جانبداری کے رجحانات تاریخ کے اندر غلطیوں اور فروگذاشتوں کے ذمہ دار ہیں، ایک ہی واقعے کی مختلف تاویل کی حقیقت کے متعلق جدید دور کے سماجیات کے ایک ماہر کارل مینہیم KARL MANN-HEIM کا یہ نظریہ کہ "علم کی حقیقی ہیئیت کو ہر ایک کلچر اپنے مخصوص انداز میں مسخ کر دیتا ہے" ابن خلدون کے نظریے سے مطابقت رکھتا ہے۔

اس صورت حال سے اجتناب کے لیے ابن خلدون کی تجویز ہے کہ سماجی تبدیلی کے پس منظر میں سماجی واقعات کے اسباب اور کیفیتوں کا علم ہونا چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ سماجی تبدیلی کبھی تو صریحی اور تیز رفتار ہوتی ہے اور کبھی مخفی اور مضمر ہوتی ہے۔ ابن خلدون کا یہ نظریہ کہ "تاریخی حقائق کی تاویل زمان و مکان کے سیاق و سباق میں اور اس سماجی گروہ کے تعلق سے ہونی چاہیے جس سے ان حقائق کا سابقہ ہو" دراصل اپنے وقت کے لحاظ سے بالکل نیا، انوکھا اور حیرت انگیز طور پر سائنٹفک ہے اور ہمارے موجودہ مطالعے کے لیے موزوں اور برمحل بھی۔

حقائق کی داخلی معنویت تک رسائی کے جس مسئلے کی ابن خلدون نے نشاندہی کی ہے اس نے آگے چل کر اجتماعیات و تمدن انسانی کے ماہرین کے ان منہاجی حربوں اور طریقہ تحقیق و تفتیش سے لیس ہونے میں رہنمائی کی۔ جن میں داخلیت EMIC

یعنی خود متعلقہ لوگوں کی طرف سے پیش کردہ توضیح یا پھر خارجیت ETIC یعنی مبصر کی تعبیر یا پھر داخلیت و خارجیت EMITIC یعنی متعلقہ لوگوں اور مبصر کی تعبیروں کے امتزاج کا تصور بھی شامل ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ سماجی سائنسداں خواہ وہ مورخ ہو یا سماجیات داں یا سماجی یا تمدن انسانی کا واقف کار 'اقدار' کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہوتا۔ اقدار کے اثرات اس کی تحقیقات کے موضوع اور مقصد پہ مترتب ہوتے ہیں اور ان پر اس کے سماجی ماحول اور خود اس کی تربیت SOCIALISA-TION کا بھی اثر ہوتا ہے کیونکہ ان کے زیر اثر اس کے عقائد، جذبات اور اس کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے اور ان کے شکنجے سے وہ پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا۔

انسانی علوم کے میدان میں تحقیقات ایک اور لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے تحقیقات کے بیشتر منصوبے خاصے قیمتی اور طاقت ور اور ذی اقتدار مفادات کی کفالت SPONSORSHIP کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایسے مفادات تحقیقاتی کاموں کی جہت، نوعیت، معیار اور ان کی غیر جانبداری پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ایک اور حقیقت کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ جو یہ ہے کہ سماجیات اور سماجی اور انسانی تمدن کے شعبوں نے باقاعدہ امتیازی علوم کی حیثیت اس دور میں حاصل کی جب مغربی اقوام نے عہد وسطیٰ کے حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا کر بالادستی حاصل کی اور اپنی بحری طاقت کے بل پر ایشیا اور افریقہ کے ایک بڑے حصے کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ نوآبادیاتی عہد میں سماجیات اور سماجی انسانیات علم کے عروج پذیر شعبے بن گئے اور اس پورے عہد میں سماجی

سائنسدانوں کی توجہ محکوم غیر یوروپی اقوام کے حالات کا تجزیہ کرنے اور انہیں قلم بند کرنے پر مرکوز تھی اور یہ سب وہ نوآبادیاتی نظم و نسق کے مفادات کے لیے کر رہے تھے۔ انسانیاتی مطالعوں کے لیے پیش کردہ تصورات اور نظریات پر اس نوآبادیاتی عہد کے گہرے اثرات نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر اگر برطانوی انسانیات دانوں کے پیش کردہ نظریہ وظیفیت یا فعلیت FUNCTIONALISM کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس نے قبولیت کا درجہ اس لیے حاصل کر لیا تھا کہ اس سے نوآبادیاتی حکومتوں کی ضروریات پوری ہوتی تھیں FUNCTIONALISM کا نظریہ اس مفروضہ پر قائم ہے کہ سماج نسبتاً غیر مبدل عناصر کی ایک ترتیب ہے اور توافق یا مطابقت سماجی نظام کا ایک حاضر الوجود عنصر ہے[1]۔ چونکہ وظیفیت کا تصور اس مفروضے پر مبنی ہے کہ سماجی نظام متفقہ قدروں کی مسلمہ صورت ہے اس لیے اس میں سماجی رشتوں کے اندر اقتدار کے رول کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ بلکہ اک سرے سے نظر انداز کیا گیا ہے۔

نوآبادیاتی حالات میں جہاں حکمرانوں کو افریقہ کی وسیع مملکت پر تھوڑے سے سفید فام لوگوں اور کم سے کم وسائل کی مدد سے حکومت کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میلنوسکی MALINOWSKE کے نظریۂ وظیفیت اور اس کے مرکوز فیلڈ ورک کے تصور کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ افریقی نوآبادیات کے اندر ان حالات میں

---

[1] FUNCTIONALISM ASSUMS THAT SOCIETY IS A RELATIVELY PERSISTING CONFIGURATION OF ELEMENTS AND CONSEUS IS UBIQUITOUS ELEMENT OF THE SOCIAL SYSTEM:

بالواسطہ حکومت کرنے کی ضرورت تھی اور اس نامور برطانوی ماہر انسانیات نے اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطالعات کو بڑے پیمانہ پر رائج کرکے استعماری قوتوں کے ہاتھ مضبوط کیے۔ بالواسطہ حکمرانی کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ محکوم گروہ کے سرکردہ لوگوں کو آلۂ کار بناکر نوآبادیاتی حکمرانوں کے معین کردہ حدود کے اندر اپنے داخلی نظم و نسق کی اجازت دی جائے۔ اس کام کے لیے متعلقہ گروہ کے ویسے ہی انسانیاتی مطالعے کی ضرورت تھی جو STRUCTURAL FUNCTIO-NAL ضابطوں کے مطابق عمل میں آیا ہو۔ اس طرح کے مطالعے میں سماجی اور سیاسی تنظیم سے واقفیت کے ساتھ اس امر کی وضاحت درکار تھی کہ سماجی امور کس طرح انجام پاتے ہیں۔ (ملاحظہ فرمایئے LACKNER، 1973)

تعلیلی FUNCTIONALIST چوکھٹے کے اندر محکوموں کے حالات کے مطالعات کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ حالات کے بدستور رہنے پر زور ہو اور سماجی و سیاسی تبدیلی کی گنجائش نہ ہو۔ ایسے مطالعے بالواسطہ نوآبادیاتی نظام کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ ان میں جبر و تشدد اور مظالم پر نکتہ چینی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ترکیبی وظیفتی STRUCTURAL FUNCTIONAL چوکھٹے کے اندر مطالعے خواہ وہ ای۔ ای۔ ایوانس پرچرڈ E. E. EVANSPRITCHERD کی مصنفہ نیور NEUR (1940) ہو یا ایس۔ ایف نادل S.F. NADEL کی اے بلیک بائزنٹیم A BLACK BYZANTIAM (1942) اور دی نیوبا NUBA (1947) ہو ان سب مطالعات میں متعلقہ معاشرے کے اندر اقتدار کے رول کی طرف مطلق توجہ نہیں دی گئی ہے۔ گویا طاقت کے زور سے مسلط

نوآبادی نظام ان کی تنظیم کا جزو ہے اور سزاوار تنقید نہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ انسانیاتی مطالعات کی منہاجیاتی ترقی، خصوصاً تصورات، نظریات اور مطالعات کے نمونہ کی شکل میں، نوآبادیاتی قوتوں کی ضروریات کے مطابق عمل میں آتی رہی ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ وظیفیت FUNCTION-ALISM کی اہمیت نوآبادیاتی نظام کے ٹوٹ جانے کے بعد باقی نہیں رہی اور یہ نظریہ گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔ پھر جب نوآبادیاتی نظام نے نیا چولا بدلا تو اسے نئی اطلاعات اور نئے اعداد و شمار کی ضرورت پڑی۔ کہتے ہیں کہ فریڈ ایگن FRED-EGAN کا پیش کردہ نیا طریقہ تحقیق جسے منضبط موازنہ CONTROLLED COMPA-RISION کہتے ہیں، ترقی یافتہ اور بہتر ہے۔ یہ طریقہ تحقیق ترکیبی وظیفیتی STRUC-TURAL FUNCTIONAL اصولوں اور تاریخی تخصیص پسندی[1] HISTORICAL PARTICULARISM کے امتزاج پر مبنی ہے اور نوآبادیاتی عہد کے بعد کے دور کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ مغرب کی نئی ضرورتوں کے تحت علم الانسان کے تصورات اور نظریات میں تبدیلی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہیلن لیکنر HALLEN LACKN-ER کہتی ہیں کہ

---

[1] میلنوسکی اور ریڈکلف براؤن کے نظریات کے امتزاج سے جو ترکیبی وظیفیتی یعنی STRUCTURAL FUNCTIONAL اصول نوآبادیاتی عہد میں مقبول ہوا تھا وہ بعد کے دور میں متروک ہونے لگا اور نئی ضرورتوں کے تحت فریڈ ایگن نے انسانیاتی مطالعے کے لیے جو نمونہ پیش کیا وہ ترکیبی وظیفیتی اصولوں کے ساتھ امریکی مکتب فکر کے فرینز بوس FRAN Z BOAS کے نظریہ تحقیق، تاریخی تخصیص پسندی HISTORICAL PARTICULARISM کے امتزاج پر مبنی ہے اور اسے CON-TROLLED COMPARISM کا نام دیا گیا ہے۔

اب ترکیبی و ظیفیتی نظریہ متروک ہو چکا ہے اور نو آبادیاتی نظام کی بدلی ہوئی شکل ایک
طرح کی شہنشاہیت جیسی ہے۔ اس نئے نظام کی کامیابی کے لیے نئے نظریات اور نئے
تصورات کی ضرورت تھی اور فریڈ ایگن FRED EAGAN نے یہ ضرورت پوری کرنے
کی کوشش کی۔ امریکہ میں بھی نئی ضرورتوں کے تحت علم الانسان کے اعداد و شمار کے
حصول اور ان کے تجزیہ کے طریقوں میں تبدیلی دکھائی دیتی ہے اور یہ تبدیلی اس کے
اپنے مفادات کے تابع ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرتے ہی امریکہ نے دوسری اقوام کو 'مہذب
بنانے' کے نام پر کھلم کھلا مداخلت کے ذریعہ انہیں اپنے مرتب کردہ 'عالمی نظام' کو تسلیم
کرنے پر مجبور کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر خود امریکی نظریہ
نسبتیت[1] RELATIVISM کی جگہ ارتقائیت[2] EVOLUTIONISM
کی بڑھتی ہوئی مقبولیت قابل فہم ہے۔

---

[1] تمدنی نسبتیت CUTUR AL RELATIVISM سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی مثبت یا منفی رسم
و رواج کے مناسب یا نامناسب ہونے کے بارے میں متعلقہ جماعت کے دوسرے گروہی
عادات کو پیش نظر رکھ کر ہی کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر تعدد ازدواج اقتصادی
اعتبار سے بعض گروہوں کے لیے مناسب ہو سکتا ہے۔ [2] ارتقائیت EVOLUTIONISM
کا تمدنی نظریہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ سب ہی تہذیبیں مختلف ادوار سے گزر کر اپنی موجودہ سطح پر
پہنچی ہیں اور انہیں اسی تمدنی نقطۂ عروج پر پہونچنا ہے جس کی نشاندہی امریکی تہذیب سے ہوتی ہے۔
جدید امریکی ارتقائیت کا مقصد انسانی تہذیب کو اپنی معین کردہ راہ پر چلانے کے لیے جد و جہد کرنا
ہے اور اس کام کے لیے اسے GENETICS اور سوشل انجینئرنگ کو کام میں لانا ہے۔

انسانی علوم سے متعلق تصورات اور نظریات کی ارتقائی تاریخ پر نظر ڈالنے
سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کم از کم انسانیات کے ماہرین کے ایک حلقے نے ایسے
تصورات اور نظریات پیش کیے ہیں جن سے نو آبادیاتی اور استعمار پسند قوتوں کے ہاتھ
مضبوط ہوتے ہیں اور انہیں اپنے زیر دستوں کو زیر نگیں رکھنے میں مدد ملتی رہی ہے۔
انھوں نے اپنی تحقیقاتی تصنیفات کو عوام الناس اور محکوم و مظلوم طبقات کے مفاد کے
خلاف ذی اقتدار اور استحصال پسند طبقوں کے استعمال کی اجازت دی ہے بلکہ انکا
آلۂ کار بن کر کام کیا ہے۔ جیرالڈ بیرامین نے اپنے مقالے مطبوعہ کرنٹ انتھراپالوجی شمارہ
۱۹۶۳ء میں تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح امریکی انتظامیہ امریکی فوجی عملہ اور امریکی خفیہ
ایجنسی سی۔ آئی۔ اے انسانیات کے ماہرین کی تحقیقاتی تصانیف اپنے مقاصد کیلئے
استعمال کرتی ہے۔

ہندوستان میں بھی برطانوی مورخوں، سماجیات دانوں اور انسانیات کے
ماہرین کا حصہ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ انھوں نے اپنے
پیشے کے اخلاقی ضابطوں کو پس پشت ڈال کر بڑی جانفشانی سے محکوم لوگوں کے آپس کے
فرق پر گہری نظر ڈالی اور بڑی مبالغہ آمیزی کے ساتھ اسے برسر عام لائے۔ انھوں نے
اپنے مطالعے کے ماحصل کو ہندوستانی عوام کو استحصال کرنے والی طاقتوں کے سامنے
پیش کیا اور اکثر حالتوں میں حکومت کو ایسی حکمت عملی کے اپنانے میں مدد دی جو محکوموں
کے جائز مفادات کے خلاف تھی۔ اس اہم اور فیصلہ کن دور کے سماجی سائنسدانوں
اور دانشوروں نے جو اکثر حالتوں میں برطانوی انتظامیہ کے اعلیٰ افسر بھی تھے ہندوستانی
عوام کی تہذیب کے مشترک عناصر پر روشنی ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی بددیانتی کا

ثبوت دیتے ہوئے منافقانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ اس عہد میں سوشل سائنس استحصال کرنے والی طاقتوں کے زیرِ نگیں ہو گیا جس کے دیرپا اثرات ہونے لازمی تھے۔

سب سے پہلے سر ہنری مین SIR HENRY MAN نے ہندوستانی معاشرے پر دو کتابیں تصنیف کیں۔ پہلی کتاب ANCIENT LAW (1861) میں اور دوسری VILLAGE COMMUNITIES IN EAST & WEST (1871) میں لکھ کر برطانوی انتظامیہ کے لیے مفید خدمت انجام دی جو برطانوی سماجیات دانوں کو دعوتِ فکر بھی دے رہی تھیں۔ سر ایلفرڈ لیال SIR ALFRED LYALL جو اعلیٰ برطانوی افسر ہونے کے ساتھ سماجیات داں بھی تھے، سر ہنری مین سے بے حد متاثر ہوئے اور ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کی تشکیل میں ان سے مدد لی۔ سر ایلفرڈ کے مضامین کا مجموعہ جو ایشاٹک اسٹڈیز کے عنوان سے ۱۸۸۲ء میں شایع ہوا اس میں بڑی وضاحت کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے متعلق نئی برطانوی حکمت عملی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ایلفرڈ لیال کے مضامین کے اس مجموعے میں دو مضامین ریلیجن آف این انڈین پراونس RELIGION OF AN INDIAN PROVINCE اور ریلیجیس سچویشن ان انڈیا RELIGIOUS SITUATION IN INDIA خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں تعجب کی بات نہیں کہ برطانوی نوآبادیاتی حکومت کا یہ اعلیٰ افسر اور مشیر ہندوستان میں برطانوی حکومت کو ہندوؤں کے لیے رحمت تصور کرتا ہے جس نے اس کے خیال کے مطابق انہیں بدترین قسم کے تاراج، عدم تحفظ، لاقانونیت اور مطلق العنان اور جابر حکمرانوں کی تلون مزاجی سے نجات دلائی تھی۔ سر ایلفرڈ نے اپنے مضامین میں سارا زور برطانوی عہد سے پیشتر کے دور کی حکومتوں میں سنگین نقائص کی نشاندہی پر صرف کیا جو

اس کے خیال کے بموجب بربریت اور ہندوؤں پر پیہم اذیت و تعذیب کا دور تھا۔ تاریخی حقایق کی روشنی میں اس طرح کے بیانات قطعاً دروغ گوئی پر مبنی دکھائی دیں گے اور خود کچھ دوسرے برطانوی مورخین و بیٹر ہملٹن (۱۸۱۲ء) اور جیمس مل (۱۸۱۷ء) کی تحریروں سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حکومت کے اعلیٰ ترین مشیر اور سماجی سائنسداں کے قلم سے اس طرح کے بیانات کے مقاصد اور ان کے اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ابتدائی دور کے برطانوی دانشوروں کے اندر برطانوی سلطنت کو استحکام بخشنے اور اسی قدر محکوم اقوام کے داخلی اتحاد کو کمزور کرنے کا جو جذبہ شدت سے موجود تھا اس کا بخوبی اظہار ہو جاتا ہے۔ انھوں نے عہد وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کے متعلق اس طرح کے خیالات کے اظہار کو اپنی عادت میں داخل کر لیا تھا۔ یوروپی مستشرقین نے انکی عینک پہلے سے ہی رنگین کر دی تھی اور جو فرضی خاکہ ان کے سامنے تھا وہ اسی میں رنگ بھرنے پر اپنی ساری کاوش صرف کرتے تھے۔ اس صورت حال کے کچھ بنیادی اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے طلال اسد اپنی کتاب ANTHROPOLOGY AND THE COLONIAL ENCOUNTER میں لکھتے ہیں کہ "مسلم آبادی پر مشتمل وسیع خطۂ ارض پر قبضہ جمانے والے شہنشاہیت کے یہ علمبردار اپنی حکمران حیثیت کے لیے یوروپی مستشرقین کے فراہم کردہ دلائل سے جواز پیش کرنے کی کوشش کے سوا اور کیا کر سکتے تھے اور وہ دلائل یہ تھے کہ (۱) تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کی حکومتیں ظالم اور جابر تھیں (نوآبادیاتی حکومتیں رحمدل ہیں) (۲) اسلامی سیاسی نظریہ واقعی DEFACTO حکومت کو جائز تصور کرتا ہے (نوآبادیاتی حکومت بد عنوانی، نااہلی اور بدامنی سے بدرجہا بہتر ہے)

(۳) اسلامی ممالک میں سیاسی اقتدار اسلامی سماجی اور مذہبی زندگی کی گرفت سے باہر ہوا کرتا تھا۔ (اس لیے ان ممالک کی تسخیر سے اسلامی روایات کو ٹھیس نہیں پہونچتی کیونکہ مرکزی سیاسی روایت کا تسلسل قائم اور برقرار ہے)۔

مسلمان حکمرانوں اور ان کی رعایا کے درمیان تعلقات کے بارے میں یوروپی مستشرقین کے تاثرات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے طلال اسد مزید لکھتے ہیں کہ ان کی بنیاد نہ صرف جارح اسلام کے عیسائی تجربے پر ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ یوروپ کے درمیانی طبقے کی اس تشخیص پر ہے کہ "اسلام غیر ترقی پسند اور دقیانوسی ہے اور نو آبادیاتی حکومت کے استحکام کی خاطر اس پر بلا واسطہ کنٹرول ضروری ہے"۔ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مغرب کا یہ گہرا تاثر نو آبادیاتی عہد کے خاتمے کے بعد بھی قائم ہے اور ان کا سماجی نظام اسلامی ملکوں کے استحصال کی غرض سے اس تاثر کو قائم و دائم رکھنے کے لیے کوشاں ہے خواہ اس سے ان کی قدروں، خصوصاً جمہوریت کا خون ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔

عہد وسطیٰ کے مسلمان حکمرانوں پر سخت تنقید اور ہندوؤں کو ان کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کا دعوی کرتے ہوئے بھی سر الفریڈ لیال کے یہاں ہندو تہذیب کے لیے اچھے الفاظ نہیں۔ وہ ہندوؤں کو بقول خود توہمات کی گمراہی اور جہالت کی تاریکی سے نکال کر اس 'شاندار' تہذیب کا حلقہ بگوش بنانا چاہتے تھے جسے برطانوی حکمراں اور مشنریاں اپنے ساتھ لائی تھیں اور نسل انسانی کے سرپرست اور پاسباں کی حیثیت سے سارے جہاں میں پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

لیکن نسل انسانی کے یہ خود ساختہ سرپرست جنھوں نے ہندوؤں کو "تہذیب" سے روشناس کرنے اور انہیں بدترین قسم کی بدامنی، عدم تحفظ، لاقانونیت اور مطلق العنان

فرمانرواؤں کی تلون مزاجی کا شکار ہونے سے نجات دلانے کے عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کی ٹھانی تھی وہ اسی زمانے میں اپنی "شاندار تہذیب" کی روشنی شمالی اور مرکزی امریکہ میں پھیلانے میں جس طرح مصروف تھے وہ مقام عبرت ہے۔ ان کے ہم وطن اور دوسرے یوروپین بھائی بندوں نے اپنی "شاندار تہذیب" مرکزی اور شمالی امریکہ کے ازٹک، ٹالکسی، کیلٹکی، کلہاس، ہاؤسٹی اور ٹراسکن جیسے ترقی یافتہ اور مہذب لوگوں پر مسلط کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے اس کی کہانی انتہائی دردناک ہے۔ اگر جدید تحقیقات اسے برسر عام نہ لائی ہوتیں تو شاید یہ ساری داستان زمانے کے گرد و غبار میں ڈھکی رہجاتی۔

تہذیب و شائستگی کے ان یوروپین دعویداروں کے ساتھ امریکہ کے ان قدیم باشندوں کی مڈبھیڑ ۱۵۱۹ء میں تقریباً اسی زمانے میں ہوئی جبکہ ہندوستان کے مسلم شہنشاہ نے ہندوؤں پر کچھ الزامات عائد کرنے کے جرم میں خود اپنے قاضی القضاۃ کو سخت سزا دی تھی اور ہندوؤں کے پرستار کی حیثیت سے شہرت پائی تھی۔ یوروپین نو آبادکار "اپنی تہذیب کی روشنی پھیلانے کے لیے" شمالی اور مرکزی امریکہ کے قدیم باشندوں کو پکڑ پکڑ کر غلام بنا رہے تھے اور ان کی پُرامن بستیوں کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر رہے تھے۔ کہیں کہیں تو انھوں نے ان کی بستیوں کی پوری آبادی کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ میکسکو کی سطح مرتفع کی آبادی جو ۱۵۰۰ء میں تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ تھی وہ ۱۵۶۵ء تک یعنی صرف ۶۵ سال کے اندر ۴۴ لاکھ ۴۰ ہزار رہ گئی اور ۱۶۰۰ء تک یہ اور گھٹ کر ۲۰ لاکھ ہوگئی۔ (ملاحظہ کیجیے ٹائمز ایٹلس آن دی نیو ورلڈ مصنف چارلس وینگلی اور مارون ہیرس صفحہ ۱۷-۱۵)

یوروپین استعماریت پسندوں نے جن لوگوں کو نیست و نابود کر کے صرف ۲۰۰ سال

کے اندر ان کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ سے گھٹا کر صرف ۲۰ لاکھ کر دیا تھا وہ وحشی اور جنگلی
نہ تھے بلکہ بہت ہی اعلیٰ تہذیب کے مالک تھے۔ ان کی تہذیب میں تجارت عروج پر تھی۔
ان کی زبان اعلیٰ درجہ کی اور رسم الخط خاصا ترقی یافتہ تھا۔ ہندسے کا ایک نظام بھی
ان میں وسیع پیمانہ پر رائج تھا۔ نظام شمسی پر مبنی ان کا کیلنڈر بھی تھا۔ ان کا حکومتی نظام بہت
منظم اور انکی پروہتائی ان کے ترقی یافتہ مذہبی نظام کو بڑی خوش اسلوبی سے چلاتی تھی یہ لوگ
اہرام نما عمارتیں، عبادت خانے، قلعے اور محلات تعمیر کرتے تھے۔ ان کے پتھر کے دھاتوں کے
بنے اوزار اعلیٰ درجہ کی کاریگری کے نمونے ہوتے تھے۔ ٹونو چتلان TONOCHITLAN
اور ٹکسکوکو TEXCOCO جیسے بڑے شہر ان کی اعلیٰ تہذیب کا نمونہ تھے اور یہ دونوں شہر
میکسیکو کی وادی میں واقع تھے۔ ان شہروں کی آبادی تقریباً ۵ لاکھ افراد پر مشتمل تھی اور ان
میں ایسے بازار تھے جن میں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا اور جو اس زمانے میں اسپین کے بازاروں
سے کچھ کم نہ تھے (ملاحظہ کیجئے ماروِن اور ہیرس صفحہ ۵۰۔۴۹ مطبوعہ ۱۹۵۰ء)

لیکن اس کے برعکس ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا طرز عمل ملاحظہ کیجئے۔ ان حکمرانوں
میں کچھ تو ہندو پرست کہے جاتے ہیں اور اپنی ہندو رعایا کے خلاف کوئی اقدام کرنا تو کجا
اگر ان پر قاضی القضاۃ جیسا اعلیٰ عہدہ دار بھی انگلیاں اٹھاتا تو مستحق سزا ہوتا۔ ان
میں سے کچھ حکمرانوں کا تو راجپوتوں سے خونی رشتہ تھا اور وہ ان کے ساتھ مل کر حکومت
کرتے بلکہ انہیں حکومت میں ساجھے دار بھی بناتے تھے۔ حتیٰ کہ اورنگزیب جیسا بدنام
حکمراں اپنے محل کی حفاظت پر صرف ہندوؤں کو مامور کرتا تھا۔ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی
تاریخ کا یہ تجزیہ مسلم حکمرانوں کی وکالت کرنے والے کسی مسلمان مورخ کا نہیں، بلکہ
ایک ہندو دانشور کے۔ آر۔ ملکانی کا ہے جو ایک شدت پسند جریدے آرگنائزر کی

ادارت پر مامور رہے ہیں اور راشٹریہ سیوک سنگھ، جن سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی جیسی
جماعتوں کے اعلیٰ سربراہوں میں شامل ہیں (ملاحظہ فرمایئے ملکانی کا مضمون مطبوعہ اسٹیٹسمین
کلکتہ مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۸۰ء)

اب یوروپین مورخین کی وقائع نگاری کا معیار ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے ہم وطن،
ہم نسل اور ہم مذہب لوگوں نے شمالی امریکہ کے مہذب، شائستہ اور پرامن لوگوں پر محض
لوٹ کھسوٹ کی خاطر جو درد ناک مظالم ڈھائے اور قتل وغارت گری کا بازار گرم
کیا اس پر اظہار خیال کرنے میں ان کی زبان گونگی ہوگئی ہے اور اسے ضبط تحریر کرنے میں انکی
انگلیاں مفلوج ہوگئیں۔ ۹۰ لاکھ بے گناہوں کے خون کا ناقابل معافی جرم جو ان کے
سفید فام ہم نسل اور ہم مذہب لوگوں نے کیا وہ ان مورخین کے لیے قطعی قابل توجہ نہ تھا۔
موجودہ دور کے کچھ محققین نے ان سنگین جرائم کی تحقیقات نہ کی ہوتی تو ابتک یہ پردۂ راز
میں رہ جاتے۔ لیکن عہد وسطیٰ کے مسلمان حکمرانوں پر بہتان طرازی کے لیے انہیں بہت
مہلت تھی ہندوؤں کے خلاف مسلمان حکمرانوں کے مفروضہ جرائم، ان کے قتل عام، انکی
عورتوں کی آبروریزی اور ان کے مندروں کے انہدام کی مبالغہ آمیز، من گھڑت داستانیں
ضبط تحریر کرنے سے ان مورخوں کو گہری دلچسپی تھی اور باایں ہمہ وہ مورخ کہلانے
کے بھی دعویدار رہیں۔

دنیا کے جن جن حصوں میں یوروپین نو آباد پہونچے وہاں انھوں نے بڑے پیمانہ پر
لوٹ کھسوٹ مچایا اور انسانیت سوز حرکتیں کیں اور اسی روشنی میں ہندوستانیوں کو
'تہذیب' سے روشناس کرانے کے برطانوی دعوے کا اصل مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔
اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ نویسی کے مقدس فن کو کس طرح اپنے

مفادات کے تابع کرلیا۔ عہد وسطیٰ کی مسلم حکومتوں کے لیے یوروپی مستشرقین نے عام طور پر جو ظالم، سفاک، وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ کچھ تو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تصادم اور اس کے نتیجے میں عیسائی تجربوں کی وجہ سے اور کچھ مغربی استعماریت پسندوں کے مفادات کے سبب تھا اور مغربی مورخین نے نوآبادیاتی مفادات کی خاطر ان مستشرقین کی خوشہ چینی کی جن کی صدائے بازگشت موجودہ دور کے لٹریچر میں پائی جاتی ہے اور ان سے یوروپی اور غیر یوروپی دونوں گمراہ ہوتے ہیں اور مفاد پرست عناصر انہیں فکر وعمل کا ایک خاص رخ دیدیتے ہیں۔

ایلیٹ اور ڈاؤسن (۱۸۶۶ء) نے عہد وسطیٰ کے 'غیر ملکی' حکمرانوں اور دیسی ہندوؤں کے درمیان سلسلہ وار تصادم کی فہرست کئی جلدوں میں پیش کر کے جس

---

[1] عہد وسطیٰ کے حکمرانوں اور ان کی رعایا کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے بارے میں مستشرقین کی غلط اور غیر تبدیل رائے کی تردید کرتے ہوئے ایم۔ ار۔ اے گب اور ایچ باون لکھتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ حکومت اور عوام کے درمیان اندرونی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں ہمیں بہت کم علم ہے۔ اس میں شبہ کی گنجائش بہت کم ہے کہ حکومت کا انتظامی پہلو محض ایسے ضابطوں پر مبنی نہیں تھا جو حکمرانوں کی خواہش کے مطابق لوگوں پر مسلط کیے جاتے تھے بلکہ وہ ضابطے ایسے ہیئتی نظام کی طرح تھے جن کا تعلق معاشرے کی ساخت اور عوام الناس کی خصوصیتوں اور ان کے افکار سے بھی تھا۔ اس ہیئتی نظام کا تعلق حکومت اور محکوموں کے درمیان مسلسل ربط پر مبنی تھا ایسی یوروپین اصطلاحوں جیسے مطلق العنانی اور خود مختاری کے بے جا استعمال سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں انہیں دور کرنا اور ان کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہے (دیکھئے اسلامک سوسائٹی اینڈ دی ویسٹ جلد ۱ پارٹ ۱ صفحہ ۹، ۱۹۵۰ء لندن)

جذبہ منافقت کا اظہار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی حکومت کا پورا دور ہندو رعایا کے قتل وغارت گری کا دور تھا۔ انھوں نے جن حوالوں کا ذکر کیا ہے ان کی چھان پھٹک ہی سے اصل حقیقت سامنے آئے گی۔ تاہم ان متعصبانہ تصنیفات کے نقائص سامنے آچکے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ محمد اشرف نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان برطانوی مورخین نے انشائیہ اور غیر تاریخی دستاویزات کو بھی مستند تصور کر کے ان کے حوالے دیے ہیں۔

مرے۔ ٹی۔ ٹائٹس نے جو خود بھی متھاڈسٹ اپسکوپل چرچ کا ایک مشنری تھا اپنی کتاب انڈین اسلام مطبوعہ ۱۹۳۰ء میں اس کی تصنیف کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ "یہ مذہب (اسلام) کس طرح ہندوستان کے حدود میں داخل ہوا، کس طرح پھیلا، کس طرح وہ ..... لوگوں کی تقسیم عمل میں لایا اور منقسم لوگوں کی گروہ بندیاں ہوئیں اس نے ماحول سے کیا اثر لیا اور جدید حالات کا اس پر رد عمل کیا ہے"۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ہندوستان میں شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں چل رہی تھیں اسکو اشتعال دیتے ہوئے ٹائٹس لکھتا ہے کہ "دنیا کے مختلف گوشوں جیسے مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ، مڈغاسکر، ماریشس، ارجنٹائن، آسٹریلیا، برلن، لندن اور پیرس میں مسلمانوں کا پھیلاؤ باعث تشویش ہے" اس پر شدید گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے ٹائٹس لکھتا ہے کہ "اپنے مذاہب کی اشاعت کے جوش جنون اور عملی جدوجہد میں ہندوستانی مسلمان دنیا بھر میں سب سے آگے ہیں" (صفحہ ۱)۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مشنری سرگرمیوں کا مشاہدہ کسی بھی ایماندار مبصر پر واضح کردے گا کہ اس طرح کے بیانات بے بنیاد مگر با مقصد ہیں۔

ایف ڈبلو تھامس (۱۸۹۲ء) ہندو اور مسلم تہذیبوں کو ایک دوسرے کی ضد بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ہندو تہذیب درجہ بند ہے تو مسلم تہذیب مساوات پر مبنی ہے۔ اول الذکر اگر بت گری کو فروغ دیتی ہے تو آخر الذکر کا شعار بت شکنی ہے۔ اگر ہندو تہذیب ٹھوس اور مادی اشیاء کے سہارے فروغ پاتی ہے تو اسلامی تہذیب کی خصوصیت منفردانہ اور نظری ہے۔ ہندو تہذیب یاس اور جذباتیت پر مبنی ہے اور مسلم تہذیب ولولہ انگیز اور سادگی پسند ہے۔ ان دونوں تہذیبوں کے درمیان انتہائی بُعد اور تضاد کی خصوصیتیں بیان کرکے تھامس یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں معاشرے افق کے دو کنارے ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔ ہندو اور مسلم معاشروں کی یکجائی ان دونوں کے درمیان تصادم پر منتج ہوگی۔

تھامس نے دونوں تہذیبوں کے تضادات تو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں لیکن دونوں کے معاشرے کے معمولات OPERATIVE NORMS پر نظر نہیں ڈالی ہے اور نہ یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تضادات ان دونوں فرقوں کی زندگی میں کس طرح عمل پیرا ہیں۔ محض سرسری طور پر نگاہ دوڑانے والے مبصر کو یہ دکھائی دے گا کہ درجہ بند ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں نے جمہوری مساوات کے اصولوں کو مسترد نہیں کیا ہے۔ ہندوؤں کے اندر کئی ایک فرقے ایسے ہیں جو بت گری کی ہمت افزائی نہیں کرتے اور بت شکن کہے جا سکتے ہیں[۱]۔ ایسے مسلمان گروہ بھی موجود

۱؎ ہندوؤں کے فرقے برہمو سماج نے بت پرستی ترک کر دی ہے۔ آریہ سماج بھی بت پرستی سے اجتناب کرتے ہیں۔

ہیں جن کا روزگار بت گری ہے گو کہ وہ بت پرست نہیں ہیں[۲]۔ ہندوستان کے بیشتر حصے میں مسلمانوں کا معاشرہ بھی سماجی اعتبار سے درجہ بند ہے۔ ہندوؤں کے کئی ایک فرقے بشمول ویشنب اور برہمو سماج درجہ بندی کے خلاف ہیں اور نظام مساوات کو اپنانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم اس موضوع پر مزید تفصیل میں جانا نہیں چاہتے، صرف اس امر پر زور ڈالنا چاہیں گے کہ حقیقت کی تہ تک پہونچنے کے لیے مزید تفتیش اور چھان بین کی ضرورت ہے۔

اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اسلام اور ہندومت کی بنیادی قدریں ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں لیکن دونوں تہذیبوں کے آپسی فرق کی وجہ سے دونوں فرقوں میں تصادم کوئی ضروری نہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی تہذیب کے بنیادی اقدار معرکہ آرائی کی ہمت افزائی نہیں کرتے۔ لیکن کسی منصوبے کے تحت دونوں فرقوں کو متصادم کرنے کے لیے یہ فرق استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں ایک لمبے عرصہ تک ساتھ رہتے سہتے ان دونوں فرقوں کے درمیان نہ صرف مفاہمت پیدا ہوگئی تھی بلکہ مطابقت، یکجہتی اور ایک دوسرے کا لحاظ پیدا ہو گیا تھا، ان کا تہذیبی فرق انہیں تصادم پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ سماجی اور اقتصادی دائرہ کار میں دونوں ایک دوسرے کا تتمہ تھے اور اس صورت حال میں بنیادی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔

سماجیات دانوں کے ایک حلقے کی یہ رائے کہ بحیثیت سماجی نظام ہندومت اور اسلام باہم مربوط ہونے کی بجائے منفصل ہیں لیکن اسی طرح کا انفصال ہندومت کے درجہ بند نظام اور جمہوری نظام مساوات کے درمیان بھی ہے۔ اس کے باوجود ان

۲؎ مغربی بنگال کی ایک مسلم برادری جو پٹوا کہلاتی ہے۔ ہندوؤں کے لیے بت بناتی ہے۔

دونوں کے درمیان بامعنی تعامل دکھائی دیتا ہے اور جمہوریت اور روایتی درجہ بند سماج کے درمیان ٹکراؤ بڑے اہم مسئلے نہیں پیدا کرتا ہے۔ بلکہ ان دونوں متضاد نظریوں میں مطابقت پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ہندوں اور مسلمانوں کا مصالحت، موافقت اور یکجہی کے مرحلوں سے گزرنا کوئی غیر فطری بات نہ تھی اور صدیوں کی مدت میں ایسا ہوا۔

پھر مختلف فرقوں کے تمدنی نظام کے درمیان اتصال یا ربط کی خصوصیت انکے درمیان اچھے تعلقات کی ضمانت نہیں دیتی۔ بدھ مت اور ہندو دھرم صدیوں تک نبرد آزما رہے ہیں ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان ان کے تمدنی نظام کے ربط کے باوجود تعلقات کی نوعیت سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے۔ خود ہندوؤں کی مختلف ذاتوں کے درمیان کشمکش جدید ہندوستان کے اہم مسئلوں میں سے ہے۔ لہذا اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کے رجحانات ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ مذہبی اختلاف اور تہذیبی فرق کی بنا پر ہوں۔

بہرحال تمام مورخین، سماجیات داں اور انسانیات داں اس نوآبادیاتی طرز فکر سے متفق نہیں کہ ہندو اور مسلمان افق کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے کبھی نہیں مل سکتے اور دونوں کی یکجائی لازمی طور پر دونوں کے ٹکراؤ کا سبب ہوگی۔ برطانوی عہد سے لے کر تا حال اس انداز فکر کا غلبہ رہا اور عام ذہن کو اس حد تک متاثر کرتا رہا کہ نسلی، لسانی، سماجی اور معاشی رشتوں کی ناقابل تردید حقیقت نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔ (باقی)

محمد فرید وجدی اور ان کے افکار

از ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی علیگڑھ

۱۷۹۸ء کے بعد فرانسیسیوں اور انگریزوں نے نہ صرف مصر کو اپنے زیر نگیں کرنا چاہا بلکہ وہ اہل مصر کے مذہب اور فکر و نظر کے زاویوں کو بھی تبدیل کرنے کے خواہاں تھے، اپنے اس مقصد میں انہیں کافی حد تک کامیابی ہوئی اور وہاں کے ایک بڑے طبقہ نے ان کے افکار و خیالات قبول کرکے ان کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی دلچسپی لی لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو فرانسیسیوں اور انگریزوں کو اپنے ملک، مذہب اور تہذیب و تمدن کے لیے عظیم خطرہ تصور کرتا تھا اور ان کے خلاف قلمی جہاد کو اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔ اس طرح کے اہل قلم میں محمد فرید وجدی کا نام اہم اور ممتاز ہے۔

مختصر حالات | محمد فرید وجدی ۱۸۷۸ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی، ایک عرصہ انھوں نے دمیاط میں گزارا جہاں ان کے والد محترم ڈپٹی کلکٹر تھے، وہ اپنے والد کے ساتھ سوئٹزرلینڈ بھی گئے جہاں سے انھوں نے "الحیاۃ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا پھر قاہرہ کو انھوں نے اپنی مستقل رہائش گاہ بنایا اور محکمۂ اوقاف میں معمولی تنخواہ پہ ملازم ہوگئے۔ اس سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے ایک مطبع قائم کیا جس سے ایک روزنامہ "الدستور" نکالا جو کچھ دنوں تک جاری رہا۔ اس کے بعد "الوجدیات" کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالا۔ مجلہ

"الازہر" کے بھی وہ دس سال ایڈیٹر رہے۔ وفات سے دو سال پہلے ہی اسکی ادارت سے مستعفی ہوکر گوشہ نشین ہوگئے اور کہیں آنے جانے کا سلسلہ موقوف کردیا۔ تاہم جو لوگ ان کے گھر پر آجاتے ان سے بڑی تپاک سے ملتے۔ ۱۹۵۴ء میں قاہرہ میں ان کا انتقال ہوا۔[۲۷] انھوں نے اپنے بعد علم و تحقیق کے لازوال نقوش چھوڑے۔

بعض نمایاں خصوصیات

فرید وجدی کی شخصیت بعض حیثیتوں سے دوسروں سے مختلف نظر آتی ہے۔ علمی زندگی سے قطع نظر عام زندگی میں بھی وہ دوسروں سے نمایاں تھے۔ گوشہ نشینی اختیار کی تو اس میں راہبوں کو بھی پیچھے کردیا۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افکار و خیالات پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دی۔[۲۸] ایک دفعہ اخبار جاری رکھنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں رہ گئے تھے تو "جماعۃ ترکیا الفتاۃ" نے پیش کش کی کہ اگر وہ اخبار کو ہماری تنظیم کا ترجمان بنادیں تو روپے فراہم کردیے جائیں گے۔ لیکن انھوں نے یہ پیش کش ٹھکرادی اور اخبار کا بند ہوجانا گوارا کرلیا، جس کے بعد ملازمین اور کارکنوں کا حساب بے باق کرنے کے لیے اپنی کتابیں اور دوسری چیزیں فروخت کردیں۔[۲۹]

فرید وجدی کی سب سے نمایاں خدمت یہ ہے کہ اسلام کے مختلف پہلوؤں اور متعدد فلسفیانہ مسائل کو اپنا موضوع بناکر وہ چالیس[۳۰] سال سے زیادہ عرصہ تک اسلام کی صداقت آشکارا کرتے رہے۔ انھوں نے عربی ادب و صحافت اور مصری معاشرت پر گہرے اثرات ڈالے۔[۳۱] علم و فن اور تحقیق و تنقید میں بھی ان کا درجہ بلند پایہ ہے۔[۳۲]

فرید وجدی کی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں گزری۔ انھوں نے ۱۹۰۳ء میں پندرہ[۳۳] ہی سال کی عمر سے لکھنا شروع کردیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی کتاب "علی اطلال المذھب المادی" اس وقت منظر عام پر آئی جب مصر میں شبلی شمیل (۱۸۵۳-

۱۹۱۷ء) سلامہ موسیٰ (۱۸۸۷-۱۹۵۷ء) اور اسمٰعیل مظہر (۱۸۹۱-۱۹۶۲ء) مغربی تہذیب کے علمبردار اور بہت بڑے مبلغ تھے۔ فرید وجدی نے اس کتاب میں نہ صرف مغربی تہذیب کو ہدف تنقید بنایا بلکہ دلائل کی روشنی میں اس کے کھوکھلے پن کو بھی واضح کیا۔

فرید وجدی کی غیر معمولی اسلامی خدمات کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ جامعۂ ازہر کے فارغ التحصیل تھے، اس غلط فہمی کی یہ وجہ بھی ہوگی کہ انھوں نے معرکۃ الآرا اسلامی موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اور ایک مدت تک وہ جامعۂ ازہر کے مجلہ "الازہر" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ درحقیقت اسلام کے مختلف پہلوؤں پر انکا عبور انکی ذاتی محنت و مطالعہ کا نتیجہ تھا۔

اسلام سے دلچسپی کا سبب

یہ سوال اہم ہے کہ ازہر کے تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود بھی انہیں اسلام اور اسلامی علوم و افکار سے اس قدر غیر معمولی شغف کیوں تھا؟ اس سلسلے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

"دینی علوم اور اسلام سے میری دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ میں شروع میں شکوک و اوہام کا شکار رہا، والد محترم کی صحبتوں اور مجلسوں میں جب دینی موضوعات پر بحث و گفتگو ہوتی تو میں اسے بغور سنتا۔ لیکن جب کبھی میں خلق و کون کے بارے میں سوال کرتا تو والد صاحب مباحثہ کو ختم کردیتے اور مجھے بحث و گفتگو سے منع کرتے۔ اس سے میرے عقائد میں تزلزل آنا شروع ہوگیا جو شک و ریب میں تبدیل ہوگیا۔ جس کے بعد میرا ذہن کسی ایک رائے پر نہ جمتا۔ اسی بنا پر مجھے تمام اسلامی کتب اور عقائد، معاشرت اور فلسفہ کے مسائل و موضوعات

پر موجود لٹریچر کو غور و توجہ سے پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا اور میرا مطالعہ بھی وسیع ہوا اور میرے سامنے زندگی کا صحیح تصور واضح ہوگیا۔ اس طرح میرے شبہات دور ہوتے گئے اور مجھے شرح صدر حاصل ہوتا گیا۔ گویا شک کی وجہ سے مجھے یقین محکم کی نعمت ملی اور مجھے اپنے اور اپنے فکر پر کلی اعتماد حاصل ہوا۔[6]

صحیح اسلامی روح سے واقف ہونے کے بعد فرید وجدی نے بدعات و خرافات کے خلاف آواز بلند کی[7] اور فکر اسلامی کے محاسن اور عصری تہذیب کی شناعت کی وضاحت کی اور اس پر مختلف مجلات مؤید[8]، اللواء[9]، الدستور[10]، الجہاد[11] اور الازہر وغیرہ میں مضامین لکھے۔

فرید وجدی کی فلسفہ پہ گہری نظر تھی اور ان کا اسلوب بھی فلسفیانہ ہے۔ انکا خیال ہے کہ:

"فلسفہ سے دنیا کی بہت سی اشیاء کے حقایق کا ادراک اور وجود سرمدی کے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ کائنات کے عجائب پر غور و خوض کرے اور اس کی نت نئی تبدیلیوں اور موت و حیات کی معنوی تہوں تک پہونچنے کی کوشش کرے۔

اسلام کا مطالعہ میں نے قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسلام معنوی اور مادی دونوں حیثیتوں سے تمام عصری قوانین سے بالا و برتر ہے، یہی وجہ ہے کہ میں عصر حاضر کی ہر تہذیب و ثقافت سے کنارہ کش ہو کر اسلام کا گرویدہ ہو گیا اور مسلمانوں کو تاریکیوں سے نکال کر اسلام کی بخشی

ہوئی روشنی میں لانا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔[12]

فرید وجدی خلود و بقائے روح کے قائل تھے۔[13]

تصنیفات | فرید وجدی نے درج ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

(۱) المدنیۃ والاسلام (۲) دائرۃ معارف القرن الرابع عشر والعشرین، یہ دراصل انسائیکلوپیڈیا ہے جو نو جلدوں پہ مشتمل ہے، یہ عظیم الشان کام انھوں نے تن تنہا تیس سال میں انجام دیا اور یہ ۱۹۳۰ء میں پایۂ اختتام کو پہونچا۔ اس کی طباعت کے لیے انھوں نے ایک پریس بھی خریدا[14]۔ (۳) ماوراء المادہ (دو جلدیں) (۴) صفوۃ القرآن (قرآن کی مختصر تفسیر) (۵) الحدیقۃ الفکریہ فی اثبات وجود اللہ بالبراہین الطبیعیہ (۶) المرأۃ المسلمہ (۷) الاسلام فی عصر العلم (دو جلدیں) (۸) کنز العلوم واللغہ (۹) علی اطلال المذہب المادی (۱۰) مجموعۃ الرسائل الفلسفیہ (۱۱) کتاب المعلمین (۱۲) نقد کتاب الشعر الجاہلی۔[15]

فرید وجدی کی یہ تمام تصانیف موضوع اور استدلال کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ یہاں ہم ان کی دستیاب شدہ کتابوں کا اختصار کے ساتھ تعارف کرائیں گے تاکہ اردو خواں طبقہ کو بھی انکی خدمات سے کسی قدر واقفیت ہو جائے۔

المدنیۃ والاسلام:۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۸۹۹ء میں پہلے فرانسیسی زبان میں لکھی تھی۔ اس کے بعد اسے "تطبیق الدیانۃ الاسلامیہ علی نوامیس المدنیہ" کے عنوان سے عربی میں منتقل کیا لیکن دوسرے ایڈیشن میں اس کا نام تبدیل کر کے "المدنیہ والاسلام" کر دیا[16] اس میں اسلام کا مکمل تعارف کرایا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جس وقت یہ کتاب ہندوستان میں آئی تو نواب محسن الملک (۱۹۳۷ء-۱۹۰۷ء)

نے اس کی اہمیت کی طرف ان لفظوں میں توجہ دلائی۔

"اس قسم کے عالمانہ اور محققانہ مضامین کو دیکھ کر میں نے چاہا کہ ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی بھی ان سے محروم نہ رہیں اور شرک و بدعت اور تقلید واوہام کے پردے جو ان کی چشم بصیرت پر پڑے ہوئے ہیں دور ہوں اور وہ اسلام کی اصلی حقیقت سے واقف ہوں اور دیکھیں کہ خود ان کے علماء اور حکماء کیا کہتے ہیں اور اسلام کی حقیقت کیا بتاتے ہیں"[17]

محسن الملک اس کتاب سے بہت متاثر تھے، انہی کی خواہش پر مولوی رشید احمد نے اسے اردو میں منتقل کیا اور جب یہ کتاب اردو میں چھپ گئی تو انھوں نے فرمایا:

"مجھکو امید ہے کہ اس ترجمہ سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچے گا اور جو مسلمان عربی نہیں جانتے ان کو معلوم ہوگا کہ اسلام کیا ہے اور جو طالب علم اپنے مذہب سے بے خبر ہیں اور انگریزی تعلیم ان کے دلوں میں ملحدانہ اور لاادریانہ شکوک پیدا کر رہی ہے۔ یہ کتاب ان کے دلوں سے ان تمام شبہات کو دور کر دے گی اور اسلام کی روشنی سے ان کے دل منور ہو جاویں گے"[18]

المدنیۃ والاسلام درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) الانسان (۲) تکالیف الحیاۃ (۳) الدین والعلم (۴) ماہو الاسلام (۵) الناموس الاعظم للمدنیۃ (۶) جہاد الانسان لتوالی الحریہ (۷) حریۃ النفس (۸) حریۃ العقل (۹) حریۃ العلم (۱۰) الواجبات الشخصیہ (۱۱) مطالب النفس (۱۲) تطہیر النفس من الاوہام (۱۳) تہذیب النفس بالعلم (۱۴) تادیب النفس بمکارم الخصال (۱۵) تصحیح الاعتقاد (۱۶) الاعتدال فی مطالب الجثمان (۱۷) المطالب الجسمیہ (۱۸)

حفظ الصحۃ (۱۹) الواجبات العائلیہ (۲۰) الواجب الاول۔ اصلاح حال العائلہ ادبیا۔ (۲۱) الواجب الثانی۔ اصلاح حال العائلہ مادیا (۲۲) مقام العمل والجد فی نظر الاسلام (۲۳) الواجبات الاجتماعیہ (۲۴) استطرادالی الرق فی الاسلام (۲۵) واجبات المسلمین بالنسبۃ للذمیین (۲۶) واجبات المسلمین بالنسبۃ لمعاہدیہم (۲۷) واجبات المسلمین بالنسبۃ لمحاربیہم (۲۸) نظرۃ علی الاسلام والمسلمین۔

ان عنوانات ہی سے کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاہم ذیل میں اس کے چند ابواب کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔

"باب الدین والعلم" میں فرید وجدی نے علمائے یورپ کے حوالے سے بتایا ہے کہ وہ علم اور مذہب کو متضاد تصور کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی وجہ سے تفکر وتدبر کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

لیکن فرید وجدی اسلام کے متعلق واضح کرتے ہیں کہ اس میں تفکر وتدبر کی پوری آزادی ہے اور یہ دین بنی نوع انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب اس کا شعور ہر طرح بالغ ہو چکا تھا۔ تاکہ وہ ان پر حجت بن سکے اور اس کے ذریعہ انہیں حق وعدل اور ہدایت کے راستوں کی جانب رہنمائی مل سکے جس کے بعد اس کے لیے شک وانکار کی گنجایش باقی نہ رہ جائے۔[19]

فرید وجدی آگے فرماتے ہیں یہ ہمارا پختہ یقین ہے کہ اسلام علم وعقل کے مطابق ہے اور مذاہب کے بارے میں علمائے یورپ کے جو خیالات ہیں ان کا انطباق مذہب اسلام پر نہیں ہوتا۔[20]

باب حریۃ النفس" میں قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے فخر ومباہات کے تمام ستون مسمار کر دئے ہیں اور صرف تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا ہے"۔

اس نے فضل و معیشت کا دروازہ تمام لوگوں کے لیے وا کر دیا اور اپنے پیروکاروں کو ان لوگوں کی اتباع سے منع کیا ہے جو خود کو سعادت و شقاوت کا مالک قرار دیتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص خود کو عالم گردانے وہ جاہل ہے"[21]۔ فرید وجدی نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے متعدد آیات و احادیث پیش کی ہیں۔ ذیل میں صرف ایک آیت اور ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ	ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور
وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (المومنون: ۲۳/۱۰۱)	نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔

حدیث شریف ملاحظہ ہو:۔

"یا عباس ویا صفیۃ عمی النبی	اے عباس! (رسول اللہ صلی اللہ علیہ
ویا فاطمۃ بنت محمد انی لست	وسلم کے چچا)، یا صفیہ (آپ کی پھوپھی)
اغنی عنکم من اللہ شیئا ان لی	اور اے فاطمہ! (آپ کی صاحبزادی)
عملی ولکم عملکم"	میں اللہ کے یہاں تم لوگوں کے لیے کچھ
	نہیں کر سکوں گا۔ میرا عمل میرے لیے اور
	تم لوگوں کا تمہارے لیے۔

باب حریۃ العقل میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ مذہب اسلام میں عقل کو آزادی حاصل ہے۔ معاملات کی پرکھ اور کھرے کھوٹے میں تمیز کی بنا پر اسے انسان کی فضیلت کا معیار قرار دیا گیا ہے، صرف عبادت و ریاضت کو افضلیت کا معیار سمجھنا غلط ہے[22]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یعجبنکم اسلام رجل حتی	تم کسی کی دینداری پر ہرگز مت جاؤ۔

تنظروا ماذا عقدة عقله۔	یہاں تک کہ تمہیں اس کی عقل کا اندازہ ہو جائے۔

آگے حریۃ العلم میں بتایا کہ اسلام نے حصول علم کے سلسلے میں تمام بندشوں کو توڑ دیا اور علم کو تمام لوگوں اور تمام ملکوں کے لیے عام کر دیا۔ اس کے نزدیک اکتساب علم کے لیے جدوجہد عبادت ہے[23]۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

افضل العبادۃ طلب العلم	تلاش علم افضل ترین عبادت ہے۔

دوسرے موقع پر فرمایا:۔

نظر الرجل فی العلم ساعۃ	علم و تحقیق میں ایک لمحہ گزارنا انسان
خیر لہ من عبادۃ ستین	کے لیے اس کی ستر سال کی عبادت
سنۃ۔	سے بہتر ہے۔

قرآن کریم کی بے شمار آیات میں انسان کو کائنات اور اس کے نظام میں تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے[24]۔ اور حقائق کائنات پر غور نہ کرنے والوں کو مورد الزام قرار دیا گیا ہے:۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ	اور آسمانوں و زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں
وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ	جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں
عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف: ۱۲/۱۰۵)	اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔

آگے فرید وجدی نے یہ بتایا ہے کہ اسلام میں ایک آدمی کے ذاتی فرائض کیا ہیں، اس پر خاندان اور معاشرے کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں۔ فرید وجدی کی یہ بحث عالمانہ ہے۔ انھوں نے نفوس انسانی کی اصلاح و تربیت کے لیے اوہام و خرافات سے

بچے، انہیں معلومات صحیحہ سے آراستہ ہونے، اوصاف حمیدہ کا خوگر ہونے اور عقائد کو درست کرنے پر پورا زور دیا ہے۔[25] اور اس پر آیات واحادیث کی روشنی میں مفصل بحث کی ہے۔[26]

باب تادیب النفس بمکارم الخصال میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسلام نے انسان کو کن امور کی تاکید کی ہے اور کن باتوں سے روکا ہے۔ فرید وجدی فرماتے ہیں کہ اسلام دین ودنیا کے تمام قواعد وضوابط پر مشتمل ہے۔ وہ رہبانیت کا مخالف ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ جس نے رہبانیت اختیار کی وہ ہم میں سے نہیں۔ اسلام میں اجتماعی زندگی کو ترک کرنے سے منع کیا گیا ہے۔[27] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لصبر احدکم ساعة فی بعض مواطن الاسلام خیر له من عبادة احدکم وحده اربعین عاماً۔

کسی اسلامی کام کے لیے کسی کا مشقت اٹھانا چالیس سال عبادت کرنے والے شخص کی عبادت سے بہتر ہے۔

اسلام نے لوگوں کی فطرت کے اعتبار سے جو حدود مقرر کر دیے ہیں اگر کوئی انکو توڑتا اور فطرت سے بغاوت کرتا ہے تو اس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے:۔

من لم یقبل رخصة الله کان علیه من الذنب مثل جبال عرفة۔

اللہ کی عنایت کردہ سہولتوں کو جو شخص قبول نہ کرے، اسے جبل عرفات کے برابر گناہ ملے گا۔

فرید وجدی نے "تصحیح الاعتقاد" پر بھی اچھی بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام نے جگہ جگہ تفکر وتدبر کی دعوت دی ہے کیونکہ اسی سے تلاش حق کا راستہ ہموار

ہوتا ہے اور ان لوگوں کو ہدف تنقید بنایا ہے جو اپنے آباء واجداد کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔[28] قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَاءَنَا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ (المائدہ: ۵/۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کرتے چلے جائیں گے۔ خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستے کی انہیں خبر ہی نہ ہو۔

فرید وجدی نے حفظان صحت کے باب میں اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا اور بتایا کہ حفظان صحت کے قواعد منضبط کرنے میں اسلام تمام حکما سے آگے ہے اور اسے ایمان کی بنیادوں میں سے شمار کیا ہے اور اس پر اسی طرح توجہ دینے پر زور دیا ہے جس طرح ایمان کی دوسری بنیادوں پر زور دیا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ صحت کی نعمت تمام نعمتوں سے بجز توحید کے اعلیٰ وارفع ہے۔[29]

حفظان صحت کے سلسلے میں ایک اصول یہ ہے کہ جسمانی خواہشات میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے۔ اسی لیے اسلام نے نظافت اور پاکیزگی کا حکم دیا ہے اور تمام لطیف اور پاکیزہ چیزوں کو بھی جائز قرار دیا ہے مگر حد سے زیادہ استعمال پر پابندی عائد کی ہے۔[30] قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

... وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ
الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ
مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف: ۳۱-۳۲)

اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو، خدا
اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
اے نبی ان سے کہو کس نے اللہ کی اس
زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے
بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے
خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع
کر دیں۔

اسلام نے انسان کو زیب و زینت اور بدن کی آرائش کی تعلیم اسی لیے دی ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرے اور غرور و گھمنڈ میں نہ مبتلا ہو۔[31]

باب "الواجبات العائلیہ" میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ اسلام نے اس سلسلے میں دو چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے ایک تو یہ کہ عورتوں کو اپنے تمام خاندانی امور میں شریک کیا جائے اور دوسرے مرد خود کو بچوں کی تربیت کا ذمہ دار سمجھے۔[32] عورتوں کے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ما اکرم النساء الا کریم ولا اهانهن الا لئیم۔"

شرفا ہی عورتوں کی قدر کرتے ہیں اور صرف رزیل لوگ ان کی ناقدری کرتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:-

"کلکم راع وکل راع مسئول عن رعیتہ"

ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ذمہ دار سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں

دریافت کیا جائے گا۔

باب "مقام الجد والعمل فی نظر الاسلام" میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ انسان کو کسب معاش کے لیے جدوجہد اور کد و کاوش کرنی چاہیے، اسلام کے نزدیک کسب حلال سب سے افضل عمل ہے۔

"افضل الاعمال الکسب الحلال"

رزق حلال کی تلاش سب سے عمدہ کام ہے۔

فرید وجدی کہتے ہیں کہ اگر مال و دولت سے مسلمانوں کا دور رہنا ہی مقصود ہوتا تو قرآن مجید یہ کیوں کہتا کہ:-

"وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا"

اپنا دنیا کا حصہ نہ بھولو۔

باب "واجبات المسلمین بالنسبۃ لبعضہم" میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے کہ ایک مسلمان پر واجب ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اخوت و محبت سے پیش آئے، اور ان سب کو برابر اور یکساں سمجھے خواہ وہ کسی رنگ و نسل اور پیشے سے وابستہ ہوں، امتیازات کا دار و مدار محض شخصی فضائل پر ہونا چاہیے جس کا فیصلہ خدا کے ذمہ ہے۔ باہم محبت کرنا ایمان کی اولین شرائط میں سے ہے۔[33] آپ نے فرمایا:-

"لن تدخلوا الجنۃ حتیٰ تومنوا ولن تومنوا حتیٰ تحابوا۔"

ایمان لانے کے بعد ہی جنت میں داخلہ ملے گا۔ تمہارا ایمان محبت کے بغیر ناقابل یقین ہے۔

باب "استطرادا الی الرق فی الاسلام" میں فرید وجدی نے احادیث و آثار کی روشنی میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب اسلام نے غلامی کو ہر طرح سے ناپسند کیا ہے،

اور غلاموں کو بھی اپنا بھائی بند تصور کرنے پر زور دیا ہے:۔

"اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم۔"

تمہارے غلام جنہیں اللہ نے تمہارے قبضہ میں کیا ہے وہ تمہارے بھائی ہیں۔

باب "واجبات المسلمین بالنسبۃ للذمیین" میں اس بات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا رویہ غیر مسلموں اور ذمیوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے، ان کے عقیدہ و مذہب سے تعرض کیے بغیر ان کے ساتھ اخوت و محبت کا معاملہ کیا جائے[۳۴]۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنۃ: ۶۰/۸)

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اسلام نے انہیں ایذا رسانی سے منع کیا ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے:

من آذیٰ ذمیا فانا خصمہ ومن کنت خصمہ خصمتہ یوم القیامۃ۔"

ذمی کو ستانے والے شخص کا میں دشمن ہوں اور جس کا میں دشمن ہوں قیامت کے دن اس سے دشمنی کروں گا۔

اسی سے متعلق دوسرا باب "واجبات المسلمین بالنسبۃ لمعاہدیھم" ہے۔ اس

باب میں بتایا ہے کسی بھی قوم کے ساتھ اگر مسلمانوں کا معاہدہ ہو جائے اس کا نبھانا ہر حال میں ضروری ہے معاہدہ اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب خود فریق اسے توڑ دینے کا مرتکب ہو، مشرکین اور اہل کتاب سب اس معاملے میں برابر ہیں[۳۵]۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ: ۵/۱)

اے ایمان لانے والو عہد و پیمان کی پوری پابندی کرو۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔

من قتل معاھدا لم یرح رائحۃ الجنۃ

جس شخص نے کسی معاہدہ کیے ہوئے شخص کو قتل کیا اسے جنت کی خوشبو نہیں ملے گی۔

اس کے بعد باب "واجبات المسلمین بالنسبۃ لمحاربیھم" میں فرید وجدی نے بتایا ہے کہ ابتدا میں جب کفار مکہ کو اسلام کی دعوت دی گئی تو اسلام کے ماننے والوں کو غیر معمولی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جب ان کی مظلومی کا زمانہ ختم ہوا اور اللہ نے کامیابی عطا کی تو انہیں دشمنوں سے انتقام لینے سے منع کیا کیونکہ یہ حکمت و عدالت کے خلاف ہے[۳۶]۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ

اور دیکھو ایک گروہ جس نے تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ ہو جائے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں

وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

(المائدہ : ۵/۲)

ناروا زیادتیاں کرنے لگو، نہیں جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں۔ ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

اسلام نے اپنے دشمنوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے اور اسے بھی اس نے تعدی قرار دیا ہے۔ اگر کسی سے بدلہ لیا جائے تو اس سلسلہ میں یہ ہدایت کی کہ :-

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ

(النحل : ۱۶/۱۲۶)

اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اور انہیں تنگ کرنے سے روکا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ اسیران جنگ کے رتبوں کے مطابق انکی عزت کرتے اور خود بھوکے رہ کر انہیں اپنا کھانا کھلا دیتے، ارشاد نبوی ہے :-

استوصوا بالاسارى خيراً — قیدیوں کے ساتھ نیکی کی تلقین کرو۔

آخری باب نظرة على الاسلام والمسلمين میں بتایا ہے کہ اسلام ایک متمدن و مہذب دین ہے اور اسکے اصول کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ فطرت اور حیات انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔ دنیا جس قدر ترقی سے ہمکنار ہوگی اسی قدر اسلام کی حقانیت آشکارا ہوتی جائے گی۔ دراصل اسلام دنیوی و اخروی سعادت کا حامل وضامن ہے اور اسی میں دونوں جہاں کی راحت مضمر ہے[37]۔

آخر میں مسلمانوں کے موجودہ انحطاط و تنزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کا تصور بہت محدود ہو گیا ہے اور اس کے بہت سے اعلیٰ وارفع اصول وکلیات کو دین سے خارج کر دیا گیا ہے یہ اسلام کے غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ اب صاحب تقویٰ اسے کہا جاتا ہے جو سعی وجہد کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کرے[38]۔ (باقی)

حواشی

1 دیکھیے محمد عبدالغنی حسن۔ فن الترجمة فی الادب العربی۔ الدار المصریة للتالیف والترجمة (بدون تاریخ) ۱۴۲-۱۳۳ 2 خیرالدین الزرکلی۔ الاعلام۔ الطبعة الثانیة۔ مطبع کوستاتوماس وشرکاہ ۱۹۵۶ء۔ ۳۲۹/۶ 3 عباس محمود العقاد۔ فرید وجدی۔ المجلة۔ القاہرہ۔ ۱۹۶۳ء۔ ۷/۳، ص ۴-۵ 4 انور الجندی۔ الکتاب المعاصرون۔ مطبعة الرسالة۔ عابدین ۱۹۵۵ء۔ ص ۶۱-۶۲ 5 انور الجندی۔ الاعلام الالف۔ مطبعة الرسالة۔ عابدین۔ ۱۹۵۷ء۔ ۱/۳۴۱ 6 الکتاب المعاصرون، ص ۵۹ 7 عباس محمود العقاد۔ فرید وجدی۔ ۱۹۶۳ء۔ القاہرہ 8 "المؤید" اخبار ۱۸۸۹ء میں علی یوسف اور شیخ احمد ماضی کی ادارت میں مصر سے منظر عام پر آیا 9 "اللواء" ۱۹۲۱ء میں محمد حافظ رمضان کی ادارت میں شایع ہوا 10 "الدستور" ۱۹۲۳ء میں فرید وجدی کی ادارت میں نکلا 11 "الجہاد" ۱۹۲۶ء میں [illegible] الیوسف کی ادارت میں جاری ہوا 12 الکتاب المعاصرون ص ۶۰-۶۱ 13 ایضاً ص ۶۱ 14 الاعلام الالف ص ۳۴۳ 15 الاعلام ۷/ ۲۲۰-۲۲۱ 16 ایضاً ۷/۲۲۲ 17 دیباچہ از محسن الملک۔ المدنیة والاسلام۔ محمد فرید وجدی (رشید احمد انصاری) چوتھا ایڈیشن ہلالی پریس دہلی ۱۹۰۳ء 18 ایضاً 19 المدنیة والاسلام ص ۳۶ 20 ایضاً ص ۴۰ 21 ایضاً ص ۴۱ 22 ایضاً ص ۲۶ 23 ایضاً ص ۶۵-۶۶ 24 ایضاً ص ۶۸ 25 ایضاً ص ۶۹ 26 ایضاً ص ۸۳-۸۴ 27 ایضاً ص ۸۵ 28 ایضاً ص ۸۶ 29 ایضاً ص ۹۱-۹۲ 30 ایضاً ص ۹۵ 31 ایضاً ص ۹۶-۹۸ 32 ایضاً ص ۹۹ 33 ایضاً ص ۱۰۰-۱۰۲ 34 ایضاً ص ۱۱۳ 35 ایضاً ص ۱۲۰ 36 ایضاً ص ۱۳۶ 37 ایضاً وضاحت کے لیے ملاحظہ کریں ص ۱۳۹-۱۴۳ 38 ایضاً ص ۱۴۳ 39 ایضاً ص ۱۵۰۔

قدیم تامل ناڈو اور اس کے
موجودہ عربی مدارس اور کتبخانے

از جناب کاوش بدری صاحب آمبور

تامل ناڈو کی قدامت

HISTORY OF SOUTH INDIA کے مصنف نیل کنٹھ شاستری کا خیال ہے کہ جنوب میں انسانی زندگی تین لاکھ برس پرانی ہے۔ گو تمل ناڈو مختلف مذاہب، دراوڑی زبانوں اور رسم و رواج کا گہوارہ ہے مگر اس کثرت میں بھی وحدت (UNITY IN DIVERSITY) ہے جو یہاں کے باشندوں کو مذہب اور زبان کے اختلاف اور نسل، رنگ اور قوم کے فرق و امتیاز کے باوجود متحد رکھتی ہے، چنانچہ اسی فکری وحدت و یکجہتی کے باعث تمل ناڈو کو مورخین نے "جنت نشان" سے تعبیر کیا ہے، ایک ضعیف روایت کے مطابق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مجھے ہندوستان سے جنت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے"۔ بعض مورخین کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام جنت سے سراندیپ (لنکا) میں اتارے گئے تھے جہاں اب تک ایک پہاڑ "کوہ آدم" کے نام سے مشہور اور ہزاروں زائرین کا مقدس مرکز ہے۔ سری لنکا اور کنیا کماری کے درمیان جہاں سمندر اُتھلا ہوا ہے وہ آدم کے پل کے نام سے معروف ہے وہ اسی پل کے راستے سے جدہ کو روانہ ہوئے تھے جہاں بی بی حوا کو اتارا گیا تھا اگر عوام میں مشہور یہ روایتیں صحیح مان لی جائیں تو پہلے دراوڑی شخص حضرت آدم علیہ السلام قرار پاتے ہیں اور اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ جنوبی ہندوستان

میں ہی پہلی انسانی آبادی پائی گئی۔ جس کی تصدیق ثقافتی تاریخ اور آثار قدیمہ کی کھدائی سے دریافت شدہ چیزوں سے بھی ہوتی ہے۔

جغرافیائی وسعت

ابھی چند برس پہلے تک جغرافیائی حیثیت سے تامل ناڈو کا رقبہ بہت وسیع و عریض تھا اور یہ مختلف دراوڑی زبانیں بولنے والی پانچ ذیلی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ (۱) کرناٹک (۲) آندھرا (۳) ملیبار (۴) تمل علاقہ اور (۵) میسور۔

مغلیہ عہد میں قدیم تمل ناڈو صوبہ کرناٹک کے نام سے موسوم تھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں تقریباً سارا جنوبی ہندوستان مدراس پریسیڈنسی میں شامل تھا۔ ۱۹۵۶ء کے بعد جب لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم ہوئی تو مدراس پریسیڈنسی کو مدراس اسٹیٹ کے نام سے پکارا گیا اور پھر ۱۹۶۸ء میں اس حصہ ملک کا نام تمل ناڈو رکھ دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے بعد مدراس کے علاقہ سے آندھرا کو الگ کر دیا گیا۔ مدراس کے مختلف تاریخی نام تھے مثلاً CHANNAI PATTANAM چنیاپٹن TONDAIMANDALAM وغیرہ عربی اور فارسی تذکروں اور قدیم تاریخی کتب میں مدراس کو چنیاپٹن ہی لکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو مدراس یا تمل ناڈو کی شناخت میں مغالطہ ہوجاتا ہے۔

دراوڑی تہذیب و کلچر

دراوڑی تہذیب جنوب میں پروان چڑھی۔ یہاں کے قدیم ترین باشندے PROTO ASTRALOID نسل کے لوگ تھے جن کی ناک چپٹی اور ہونٹ موٹے تھے۔ آریوں کی آمد سے ہزاروں برس قبل EGYPT بحیرۂ روم کے علاقے کی ایک نسل نے ہندوستان (جنوبی) کا رخ کیا۔ مورخین کی دریافت کے مطابق یہ تورانی النسل تھے جو ہندوستان کے شمالی مغربی دروں کے راستوں سے پہلے شمالی ہندوستان میں آئے مگر جب شمالی ہندوستان کی آریائی اقوام نے انہیں وہاں سے بے دخل کیا تو

وہ مجبوراً جنوبی ہندوستان میں آکر بس گئے، اور انھوں نے جنوب کے قدیم باشندوں کو جنگلوں کی طرف بھگا دیا اور خود جابجا اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ بحیرۂ روم سے آنے والی نسل کے لوگ تنگ ناک لمبے سر اور اکہرے بدن کے تھے۔ انہی دونوں نسلوں کے انضمام سے موجودہ دراوڑی نسل نے جنم لیا۔ ہڑپہ کلچر کی تحقیق کے بعد ان دونوں نسلوں کے وجود کا صحیح پتہ دریافت ہوچکا ہے۔ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ ہڑپہ اور موہنجو ڈارو کی زبان قدیم ترین تمل زبان ہی کی ایک صورت تھی۔ بعض محققین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن شریف میں بھی چند تمل الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے قول کے مطابق دراوڑی تہذیب دراصل "دھرتی پوجا" کی علامت ہے اور آریائی اور دراوڑی کلچر کے اتصال سے فنونِ لطیفہ رقص، موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی، شاعری، روحانی افکار، رہن سہن کے آداب اور لٹریچر نے جنم لیا جو ہندوپاک کی تہذیب و کلچر کے امتیازی نشانات ہیں۔

عظیم الشان ہندو سلطنتیں ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں موہنجو ڈارو (سندھ) ہڑپہ (پنجاب) کی کھدائیوں سے پتہ چلا ہے کہ ہندوستان کا تمدن پانچ ہزار سال قبل مسیحؑ اور عراق کے سومری تمدن کا ہمعصر ہے۔ بقول عبداللہ یوسف علی مصنف THE MAKING OF INDIA جنوبی ہندوستان میں دراوڑیوں نے تیسری صدی قبل مسیحؑ سے تیرہویں صدی عیسوی تک جگہ جگہ عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ ان خاندانوں میں :۔

(۱) آندھرا خاندان (۲) پلوا (۳) چالوکیہ (۴) چولا (۵) پانڈیا وغیرہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندو راجاؤں نے عرب کے سیاحوں کی آؤ بھگت کی اور عربی و فارسی کے فروغ کے لیے بے دریغ تعاون کیا۔

مسلمانوں کی آمد بقول علامہ شبلی نعمانی "اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک

چپہ چپہ پر برسا لیکن فیض بقدرِ استعداد پہونچا"۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول "ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابرِ کرم کے چھینٹوں نے اس (ہندوستان) کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو سرسبز و شاداب کردیا۔ بحرِ ہند کے سواحل ملیبار، کیل کرے KILA KARAI (جنوبی آرکاٹ، تمل ناڈو) کوولم اور مدراس سے لے کر گجرات وکاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں"۔ کہا جاتا ہے کہ کوولم میں ایک صحابی حضرت تمیم انصاریؓ کا مزار ساحل سمندر پر واقع ہے اور مالابار سے مدراس تک کے درمیان کا ساحلی علاقہ معبر MABAR کہلاتا ہے۔ اہلِ عرب جنوبی ہند کے مغربی ساحل کو مالابار اور مشرقی ساحل کو معبر کہتے ہیں۔ معبر کا دوسرا نام کورومنڈل ہے۔ عرب سیاحوں اور تاجروں کے سفرناموں میں یہی نام "معبر" درج ہے۔ عرب اور ایران کے جہاز "زایح" اور "چین" جاتے آتے راستہ میں ملیبار سے گزر کر معبر کی بندرگاہوں میں بھی لنگر انداز ہوا کرتے تھے اور یہاں بھی ہجرت کی ابتدائی صدیوں میں عرب اور مصر و ایران کے ساحلی باشندوں نے آکر توطن اختیار کرلیا تھا۔

غرض ہندوستان اور خاص طور پر اس ساحلی علاقہ کا تعلق عربوں سے بہت قدیم ہے اور پہلی صدی ہجری میں ہی مسلمان یہاں آباد ہوگئے تھے، جس کی تفصیل مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" اور دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ اس لیے یہاں اس سے قطع نظر کیا جاتا ہے۔

پروفیسر افضل العلما محمد یوسف کوکن عمری مرحوم رقم طراز ہیں :۔

"پہلی اور دوسری صدی ہجری ہی میں ملیبار میں اسلام پہونچ چکا تھا۔ اس لیے اس کے اثرات تمل ناڈو کے علاقوں میں بھی محسوس ہونے لگے ۲۳۲ھ/۸۴۶ء

میں مصر کا ایک گروہ محمد خلجی کی سرکردگی میں کنیا کماری کے ساحل پر پہونچا۔ خلقِ قرآن
کے مسئلہ میں ان لوگوں میں مامون اور اس کے ہمنواؤں سے اختلاف پیدا ہوگیا تھا اور
جب جبراً اس مسئلہ کو ماننے پر مجبور کیا گیا تو وہ اپنا وطن (مصر) چھوڑ کر جنوبی ہندوستان
چلے آئے ..... یہ سب کایل پٹنم اور کیل کرے جیسے ساحلی مقامات پر آباد ہوگئے۔
... ان کی مادری زبان عربی تھی لیکن آگے چل کر انھوں نے دیسی زبان (تمل) اختیار
کی اور دونوں زبانوں میں اظہار خیال کرنے لگے۔ یہ مذہبی لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ
اپنے ساتھ تفسیر و حدیث و فقہ و کلام کی بہت سی کتابیں ساتھ لائے ہونگے اور
انہیں ایسی کتابوں کو جمع کرنے کا شوق رہا ہوگا۔ اب بھی ان کا یہ شوق باقی ہے۔
کایل پٹنم اور کیل کرے (جنوبی آرکاٹ تمل ناڈو) وغیرہ میں عربی علوم وفنون کی بہت سی
تصنیفات قلمی صورت میں موجود ہیں۔[1]

سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات سے بھی پہلے بہت سے صوفیائے کرام تمل ناڈو
پہنچ چکے تھے۔ ان حضرات کی مساعی سے بھی یہاں عربی و فارسی زبان اور اسلامی علوم و
فنون کی ترویج ہوئی اور تصوف پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

علاء الدین خلجی کے زمانے سے محمد تغلق کے اخیر زمانے تک سلاطین دہلی نے دکن پر
متعدد حملے کیے اور ہر مرتبہ لشکر کے ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ان علاقوں میں آئے اور
جب وہ واپس ہوئے تو اپنے لشکر کو بغرض انتظام یہیں چھوڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
فوج کے لاکھوں آدمی تراچناپلی، مدورے، آرکاٹ اور مدراس میں آباد ہوگئے۔ جن کی

[1] ماہنامہ آجکل دہلی (تمل ناڈو نمبر)، جون جولائی ۱۹۷۷ء مقالہ "تمل ناڈو میں عربی اور فارسی
کے نادر مخطوطات" ص ۷۸۔

زبانیں عربی فارسی اور ترکی وغیرہ تھیں، باہمی میل جول سے یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں
تحریر وتقریر، تصنیف وتالیف اور نظم ونثر کی زبان عربی، فارسی اور ریختہ ہوگئی اور
جن لوگوں کی مادری زبان تمل یا دکنی تھی انھوں نے بھی عربی فارسی اور اردو زبانوں کو اظہار
خیال کا ذریعہ بنایا اور ان میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں لکھیں، یہی وجہ ہے کہ تمل ناڈو
میں شمالی ہند سے زیادہ عربی، فارسی اور اردو کو مقبولیت حاصل ہے کیونکہ شمالی ہند میں
جب سے ہندی کا چلن عام ہوا اردو کا رواج روز بروز کم ہوتا جارہا ہے اور اردو کو ہندی
رسم الخط میں لکھنے لگے ہیں مگر جنوبی ہندوستان میں عموماً اور تمل ناڈو میں خصوصاً اردو
زبان اس لیے زندہ ہے کہ یہاں اردو کو عربی یا فارسی رسم الخط میں لکھنے کا رواج قائم
ہے اور یہاں کے علماء و ادباء کی عام بول چال کی زبان گو دکنی ہے مگر تحریر وتقریر اور
تصنیف وتالیف کی زبان کسی بھی زبان کے اہلِ زبان سے کم نہیں۔

مقامی اور بیرونی زبانوں کا فروغ اور مدارس اور کتب خانوں کا قیام

جلال الدین احسن شاہ نے ۱۳۳۳ء میں خودمختاری
کا اعلان کرکے "معبری سلطنت" کی بنا ڈالی۔ انکے
خاندان نے تقریباً ۵۰ سال تک یہاں حکومت کی اس دور میں دکنی زبان کو بہت فروغ
حاصل ہوا۔ آگے چل کر نواب ذوالفقار خاں نے جنوبی آرکاٹ کے شہر جنجی کی خراب
آب وہوا کی وجہ سے آرکاٹ کو اپنا دارالحکومت بنایا، ان کا عہد ۱۶۹۲ء سے ۱۷۰۳ء
تک رہا، اس عہد میں دکنی زبان کے ادباء وشعراء نے نثر و نظم میں ملک گیر شہرت
حاصل کی۔ ملک الشعراء نصرتی اسی عہد کا عظیم دکنی شاعر ہے۔ ناصر علی سرہندی، ہاشمی،
اور اسیر نے بھی دکنی زبان میں اپنے جوہر دکھائے۔ اسی عہد میں کتب خانوں کی
بنیاد پڑی۔

کرناٹک (قدیم تمل ناڈو) میں خاندان نوائط کا دور حکومت بھی عربی فارسی اور دکنی کے لیے بہت سازگار رہا۔ نواب سعادت اللہ خاں گلشنؔ نائطی کے عہد میں صوفی شعرا دادیار نے دکنی، اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی کافی سرمایہ چھوڑا۔ اس دور میں میر شاہ عبدالقادر میران شاہ، ولی اللہ جبلی، شیخ محمد امین، لالہ جسونت رائے منشیؔ اور عبداللہ ذاکر کی فارسی اور اردو شاعری کی دھوم تھی۔ نواب علی دوست خاں کا عہد بھی سید شاہ حمید اولیا اور نواب زین العابدین دیوانؔ کی وجہ سے کافی مشہور رہا۔

کرناٹک (قدیم تمل ناڈو) میں خاندان والاجاہی کا دور حکومت عربی فارسی اور اردو کے فروغ کے علاوہ مساجد کی تعمیر، کتب خانوں اور عربی و فارسی مدارس کے قیام کے لحاظ سے مغلیہ دور سے کم نہ تھا۔ نواب انور الدین خاں کا عہد ۱۷۴۴ء سے ۱۷۹۵ء تک رہا پھر نواب محمد علی خاں والاجاہ کے زریں عہد اور ان کے جانشینوں کے دور میں بھی علم و ادب کی بڑی سرپرستی ہوئی۔

والاجاہی دور میں تمل ناڈو کی دفتری زبان فارسی تھی اور سرکار کی سرپرستی میں بین الاقوامی تنقیدی مشاعرے با لالتزام منعقد ہوتے تھے۔ ان تنقیدی فارسی مشاعروں کی صدارت خود والئ حکومت کرتا تھا۔ عربی عوام کی مذہبی زبان تھی۔ دانشور طبقہ عربی میں نثر لکھنے اور نظم کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

تمل ناڈو کے شاعروں اور ادیبوں پر اردو میں متعدد تذکرے لکھے گئے ہیں۔ جن میں کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ ذیل میں صرف بعض تذکروں کے اور ان کے مولفین کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) تذکرہ اشارات بینش (فارسی) از مولوی سید مرتضیٰ بینش مدراسی، مطبوعہ

۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء اسے دوبارہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (دانشگاہ دہلی) نے ترتیب و تحشیہ کے ساتھ ۱۹۹۳ء میں انڈو پرشین سوسایٹی دہلی سے شایع کیا ہے۔

(۲) منظوم فارسی تذکرہ "سعید نامہ" از لالہ جسونت رائے منشیؔ لاہوری ثم مدراسی، سال تصنیف ۱۷۱۰ء تا ۱۷۳۴ء۔

(۲،۱) سعید نامہ (منظوم بزبانِ فارسی) از: سخنور کامل محمد عبدالعزیز عزتؔ غل مدراسی، مطبوعہ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء۔

(۳) تذکرہ شعرائے ریختہ گویاں (بزبان فارسی) از مرزا علی خاں لطفؔ مدراسی، سال تصنیف ۱۸۲۳ء سے پہلے۔

(۴) تذکرۃ الشعراء (بزبان فارسی) از مولوی شاہ رفیع الدین قندھاری ثم مدراسی، (تلمیذ حضرت خواجہ رحمت اللہ) مطبوعہ ۱۸۲۵ء۔

(۵) تذکرہ احباء (بزبان فارسی) از: حضرت سید حسین شاہ حقیقت بریلوی ثم مدراسی، سال تصنیف ۱۸۳۳ء۔

(۶) تذکرہ گلدستۂ کرناٹک (بزبان فارسی) از حضرت غلام علی موسیٰ رضا المخاطب بہ حکیم باقر حسین خاں راقیؔ آرکاٹی مطبوعہ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء۔

(۷) تذکرہ نتائج الافکار (بزبان فارسی) از مولانا مولوی قدرت اللہ گوپاموی ثم مدراسی، مطبوعہ ۱۸۴۳ء۔

(۸) تذکرہ معدن الجواہر (فارسی) از: مولانا مولوی محمد مہدی واصفؔ مدراسی، موصوف ہی کا تذکرہ حدیقۃ المرام (بزبان عربی) ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں شایع ہوا تھا۔

(۹) تذکرہ معاصر الشعراء (فارسی) از مولوی حکیم غلام دستگیر خاں لائقؔ مدراسی،

سال تصنیف ۱۸۵۵ء۔

(۱۰) تزک والاجاہی (فارسی تذکرہ) از سید برہان خاں ہانڈی ترچراپلی، سال تصنیف ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء۔ اس کا پہلا حصہ ۱۹۵۷ء میں پروفیسر حمزہ حسین کیفی عمری نے مرتب کرکے گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری مدراس سے شایع کیا۔ حصہ اول و دوم کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین نائناز نے کیا اور ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۹ء میں دونوں مدراس یونیورسٹی کے زیر اہتمام شایع ہوئے۔

(۱۱) سوانحاتِ ممتاز (فارسی) از: محمد کریم خیر الدین حسن غلام ضامن المعروف بہ خورشید الملک بہادر مدراسی۔ سال تصنیف ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء، اس کو پروفیسر افضل العلماء حبیب خاں سرکش داؤدی عمری مرحوم اور پروفیسر حمزہ حسین کیفی عمری مرحوم نے اڈٹ کرکے گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری مدراس کے زیر اہتمام شایع کیا اور پھر اسکا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین نائناز نے کیا جو ۱۹۴۴ء میں مدراس یونیورسٹی سے شایع ہوا۔

(۱۲) بہار اعظم جاہی (فارسی) از غلام عبد القادر ناظر مدراسی ابن غلام محی الدین معجز آرکاٹی، اس سفرنامۂ ناگور کا سال تصنیف ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء ہے جس میں عربی اشعار بھی کثرت سے شامل ہیں، اسے پروفیسر افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری مرحوم کے طویل مقدمہ کیساتھ پروفیسر حمزہ حسین کیفی عمری نے ۱۹۶۱ء میں شایع کیا، اس کا بھی انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین نائناز مرحوم نے کیا جو مدراس یونیورسٹی اسلامک سیریز نمبر ۱۱ کے تحت ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا۔

(۱۳) تقصر والاجاہی (فارسی) از: قاضی القضاۃ سید محمد حسین تمنا ترپاتوری (شمالی آرکاٹ)، یہ ضخیم تذکرہ دش اورنگ پر مشتمل ہے، سال تصنیف ۱۷۹۲ء تا ۱۸۵۵ء۔

افسوس ہے کہ یہ تذکرے تملناڈو کے عربی مدارس کے کتب خانوں میں خراب حال میں ہیں، جو کتابیں دو تین سو سال قبل شایع ہوئی تھیں ان کے دوبارہ شایع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ رہے مخطوطات تو ان کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے، اب چند مشہور کتبخانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شہر مدراس کے کتبخانے

(۱) گورنمنٹ ریکارڈ آفس لائبریری ایگمور میں عربی اور فارسی کے ہزاروں سرکاری دستاویزات کے علاوہ عربی و فارسی کے نادر مخطوطات موجود ہیں، کتبخانہ میں مختلف علوم و فنون کی ڈھائی سو (۲۵۰) برس پرانی کتابیں دستیاب ہیں، اندازاً ۵۰ ہزار سے زیادہ عربی فارسی اور اردو کی کتابیں محفوظ ہیں، جن کو قرینے سے مرتب کرکے رکھا گیا ہے۔

(۲) کتب خانۂ مخطوطاتِ شرقیہ حکومیۂ مدراس GOVERNMENT ORIENTAL MANUSCRIPT LIBRARY MADRAS یہ کتب خانہ مدراس یونیورسٹی لائبریری کے ایک حصہ میں موجود ہے۔ یہ نادر مخطوطات اور قدیم کتابوں کے نایاب نسخوں کا بیش بہا خزانہ ہے، ۱۹۴۷ء میں عربی فارسی اور اردو مخطوطات کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں کے صدیوں پرانے مخطوطات کو محفوظ کیا گیا ہے، جن کی صحیح نقل اور انہیں اڈٹ کرکے شایع کرنے کا لائحہ عمل بھی بنایا گیا ہے، یہ کام لائبریری کے کیوریٹر پروفیسر سید محمد فضل اللہ مرحوم متوفی ۱۹۷۲ء کی تقرری کے بعد شروع ہوا۔ انھیں کی جدوجہد سے مرکزی حکومت نے مذکورہ کتب خانے کے مخطوطات کی اشاعت کے لیے سالانہ ایک لاکھ روپے منظور کیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومت کی جانب سے بھی سالانہ ڈیڑھ لاکھ روپیوں کا مسلسل عطیہ RECURRCING GRANT ملنے لگا۔ عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات کی باقاعدہ نقل، اڈیٹنگ اور اشاعت کا آغاز پروفیسر

سید حمزہ حسین کیفی عمری پنگنوری کے منشی مقرر ہونے کے بعد ہوا۔ ان دونوں حضرات نے مدراس کے چند قابل اور مستند اساتذہ، حکما، ادبا اور شعرا کی خدمات حاصل کرکے ان سے بعض اہم اور نایاب مخطوطات کو اڈٹ کراکے کتابی شکل میں شایع کیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں لائبریری کی فہرست مخطوطات AN ALPHABETICAL INDEX OF URDU MANUSCRIPTS بھی کتابچہ کی شکل میں شایع ہوئی ہے۔ جس میں ۳۵ مخطوطات اور ان کے مصنفین کے اسما اور ان کے موضوعات کی صراحت کی گئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں فارسی مخطوطات کی فہرست بھی کتابی شکل میں شایع ہوئی تھی جس میں تقریباً ۶۱۴ مخطوطات کا ذکر ان کے مصنفین کے ناموں اور موضوعات کی صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ عربی مخطوطات کی فہرست ہنوز شایع نہیں ہوئی۔

(۳) کتب خانۂ عام اہلِ اسلام مدراس۔ انگریزی حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کی بنا پر مدراس کی گورنمنٹ کے ایجنٹ بالفور نے مسلمانوں کو کتب خانے اور مدرسے قائم کرنے کی ترغیب دلائی۔ چنانچہ ۲۲ رجب ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء کو پالی ٹکنک انسٹی ٹیوشن مدراس میں دن کے گیارہ بجے باشندگان مدراس کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کے علاوہ نوابینِ آرکاٹ اور شہر مدراس کے ذی اثر حضرات، علما، فضلا اور ادبا و شعرا نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ قاضی القضاۃ مولوی ارتضیٰ علی خاں بہادر خوشنود مدراسی میر مجلس بنائے گئے۔ ...... یکم محرم ۱۲۶۷ھ سے لوگوں کو اس کتبخانے کا عام رکن بنایا جانے لگا اور والیٔ کرناٹک نواب غوث خاں بہادر نے اس کو ستائیس سو روپے عطیہ دیا اور خرچ کے لیے ۳۵ روپے ماہانہ بھی مقرر فرمایا۔ گورنر مدراس سر ہنری پاٹنجر نے ۵۰ قیمتی کتابیں دیں اور نو سو چوراسی[۹۸۴] معطی افراد کی عطیات اور چندے ہوئے عام

ارکان کے ذریعہ ۵۱۳ عربی فارسی کی کتابیں جمع ہوئیں۔ اس طرح اس مشہور کتب خانے کی ابتدا ہوئی جو نہ صرف مدراس میں بلکہ سارے ہندوستان میں بے نظیر تصور کیا گیا۔ نوابینِ آرکاٹ نے ہزاروں روپے بطور عطیہ پیش کیے۔ والیٔ مصر محمد علی پاشا نے بھی کئی ترکی کتابیں روانہ کی تھیں۔ اس سے پہلے پورے ہندوستان میں اس قسم کا کوئی عمدہ کتبخانہ قائم نہیں ہوا تھا۔[1] اس وقت اس کے ناظم پروفیسر محبوب پاشا ہیں۔ والاجاہ روڈ مدراس میں واقع اس کتب خانے سے ہندوپاک کے عظیم اشخاص نے استفادہ کیا ہے۔ اس میں نوابینِ آرکاٹ کے علاوہ ملک و بیرونِ ملک کے اربابِ کمال کی متعدد فنون پر نایاب عربی فارسی اور اردو کتابیں محفوظ ہیں۔ اس کی عمارت مخدوش ہوجانے کی وجہ سے اس کا سارا سرمایۂ کتب اب ایک محفوظ جگہ میں منتقل کردیا گیا ہے۔

(۴) مدرسۂ محمدی عربک کالج دیوان صاحب باغ کی امانتی لائبریری۔ جناب صلاح الدین محمد ایوب رقم طراز ہیں کہ:

"ایک سو سال قبل مدرسہ محمدی کے قیام کے ساتھ ہی اس کا کتب خانہ بھی قائم ہوگیا جس میں اسلامیات کے تمام موضوعات پر عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ہزاروں مخطوطات و مطبوعات موجود ہیں۔ بانیانِ مدرسۂ محمدی کا تعلق مشہور نوائط خاندان سے ہے جو علمی خدمت گذاری میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس خاندان میں کتابوں کی حفاظت نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہے۔"

فخرِ خاندان مولانا محمد غوث شرف الملک (المتوفی سنہ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء) نواب

---

[1] ماخوذ از خانوادۂ قاضی بدرالدولہ اور انکے خاندان کے بعض باکمال اہلِ علم و قلم کا مختصر اور مستند تذکرہ" مرتبہ افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری، ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء ص ۱۴۴۔

کرناٹک و فرمانروا عظیم الدولہ کے دیوان تھے، ان کا خاندان جب آرکاٹ سے آکر مدراس میں آباد ہوا تو اہلِ خاندان کے پاس اپنے اپنے گھروں میں جو کتب خانے تھے انھیں ایک بڑے ہال میں عام استفادہ کے لیے کر دیا گیا اور اس کا نام "امانتی کتب خانہ خاندانِ شرف الملک" رکھا گیا۔ اس کی بے شمار کتابیں اکابر خاندان کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں اور بہت سی حج کے موقع پر خریدی گئی ہیں[1]۔ ذیل میں اس کے چند نادر مخطوطات کی فہرست دی جاتی ہے[2]۔

(۱) احکام اھل الذمہ (دنیا کا یہ واحد نسخہ ہے۔ جس کی کتابت ۸۶۹ھ/۱۴۶۴ء میں ہوئی۔ مولف کا نام شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر المعروف بہ ابن قیم الجوزیہ ہے۔

(۲) غریب الحدیث ۔ مولف ابو عبید القاسم بن سلام الہروی متوفی ۲۲۴ھ/۸۳۸ء۔ سالِ تصنیف ۱۹۷ھ/۸۱۲ء ہے۔

(۳) تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف ۔ مولف جمال الدین ابی الحجاج یوسف بن ذکی عبد الرحمٰن بن یوسف المزّی متوفی ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء۔

(۴) قرآن مجید (مطلا) اس کو زین الدین علی بن میر حبیب نے ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں لکھا تھا۔

(۵) فہرست قرآن ۔ یہ قرآن مجید کے الفاظ کی ابجد کے مطابق فہرست ہے۔ جو ٹیپو سلطان شہید کے استعمال میں بھی تھی۔

(۶) کتاب المصباح المضی فی کتاب النبی العربی الامی۔ حضورؐ کے زمانہ کے کاتبین وحی کے حالات پر مشتمل ہے۔ کاتب: ابن حدیدہ اور سن کتابت ۷۶۹ھ/۱۳۶۷ء ہے۔

(۷) الرسالۃ الشرفیہ فی النسب التالیفۃ دکتاب الادوار ۔ یہ فن موسیقی پر مشتمل مطلا نسخہ ہے جسے سیف الدین عبد المومن الرمادی البغدادی نے ہرو بن محمد بن محمد الجوینی کے لیے ہلاکو کے زمانے میں لکھا جس میں پانچ مقامات ہیں :۔

(۱) الکلام علی الصوت و لواحقہ (۲) فی حصر نسب الاعداد (۳) فی اضافۃ الابعاد (۴) ترتیب الاجناس فی طبقات الاعداد (۵) فی الایقاع و نسب الادوار کا۔

اختتام میں مختلف راگوں کے تعلق سے عربی اشعار و قطعات درج ہیں۔ اس کے دو ہی اور نسخے ہیں، قاہرہ کا نسخہ شکستہ ہے۔

(۸) تحفۃ المجاہدین فی العمل بالمیادین ۔ تالیف لاچینی المسامی (فنونِ جنگ پر مشتمل ہے۔

(۹) تحفۃ الاشراف للشیخ جمال الدین المزی الشافعی۔

(۱۰) غریب الحدیث ۔ مولف : ابو عبید قاسم بن سلام ۔

(۱۱) الذخیرۃ فی محاسن اھل الجزیرۃ ۔ مولف : ابو الحسن علی المعروف بابن بسام المتوفی ۳۰۳ھ/۹۱۵ء۔ یہ اندلس کے محدثین و علماء کے حالات پر مشتمل ہے۔

(۱۲) دلایل النبوۃ ۔ مولف حافظ موفق الدین ابو القاسم اسماعیل بن محمد بن الفضل التیمی۔

(۱۳) مجمل اللغۃ ۔ مولف ابو الحسن احمد بن فارس بن ذکریا۔ ابو الحسن علی بن خلف نے ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں اسے نقل کیا ہے۔

(۱۴) اقضیۃ الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما قضٰی فیہ او امر بالقضایہ ۔ مولف ابو عبد اللہ محمد بن فرج الطلاع ۔ سال تالیف ۷۶۸ھ/۱۳۶۶ء ہے۔

---

[1] یادگار نمبر بہ تقریب جشن صد سالہ مدرسہ محمدی مدراس ۔ دیوان صاحب باغ ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء

[2] فہرست میں متعالی حضرات کے بجائے بیرونی ممالک کے مصنفین کے مخطوطات کے ذکر ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۱۵) کتاب الایثار بمعرفۃ رواۃ الآثار۔ مولف: ابن حجر العسقلانی۔ اس میں موطا امام محمد کے رواۃ پر تنقید ہے۔

(۱۶) ارشاد العیامل الی اصول المسایل۔ مولف: الشیخ شہاب الدین احمد بن المجدی الشافعی۔ اس میں جمال الدین ابو عبداللہ المار دینی کی کتاب فلکیات "الدر المنثور فی العمل بربیع الدستور" کی شرح شامل ہے۔

(۱۷) عوارف المعارف۔ مولف شیخ شہاب الدین سہروردی المتوفی ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء

(۱۸) بلوغ المرام من أدلۃ الاحکام (فقہ) مولف ابن حجر عسقلانی۔

(۱۹) خبایا الزوایا من کتاب الطہارۃ الی التیمم۔ مولف بدرالدین محمد ابن الزرکشی تاریخ نسخ: ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء۔

(۲۰) التحریر فی شرح الفاظ التنبیہ۔ مولف یحیٰ بن شرف بن المری النواوی۔ تاریخ کتابت ۶۷۱ھ/۱۲۷۲ء۔

(۲۱) جمع الوسایل فی شرح الشمائل الجزء الاول۔ مولف ملا علی قاری۔ تاریخ نسخ خطی ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء۔

(۲۲) الترغیب والترھیب۔ مولف شیخ عبدالعظیم المنذری۔ تاریخ کتابت ۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء۔

(۲۳) کتاب الامتاع بالاربعین المبانیۃ بشرط السماع۔ مولف شہاب الدین ابی الفضل احمد بن علی بن محمد بن حجر عسقلانی۔ کاتب: محمد بن ابراہیم بن محمد بن عبداللہ تاریخ کتابت ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء۔ ابن حجر عسقلانی نے یہ حدیثیں سولہ مجلسوں میں بیان کی تھیں۔ آخری مجلس ۱۳ رمضان ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء میں حلب کے مقام میں منعقد ہوئی تھی۔

(۲۳) المنتقی السنن المسندۃ عن سید نا رسول اللہ ﷺ۔

مولف ابو محمد عبداللہ بن علی بن الجارود النیساپوری۔ تاریخ ۶۵۵ھ/۱۲۵۵ء۔

امانتی لائبریری میں ہزاروں عربی و فارسی مخطوطات ہیں اور مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، میر اکبر علی خاں، پروفیسر محمد مجیب، حکیم عبدالحمید (ہمدرد وقف دہلی) پروفیسر نذیر احمد، مولانا ابوالقاسم محمد عتیق میاں فرنگی محلی، پروفیسر مختار الدین احمد، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، قاضی اطہر مبارکپوری، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ابوالسعود احمد، ظ انصاری، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، عصام الشفطی (ادارۂ مخطوطات عربی کویت)، شریف (ایران) شرف جہاں (تاجکستان)، اسحاق جلیس ندوی مرحوم وغیرہ[1] نے اس کتبخانہ کی زیارت کی ہے اور اس کے بارے میں اپنی گرانقدر آراء تحریر فرمائی ہیں۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی نے لکھا ہے کہ "یہ دنیا کا ایک انمول کتبخانہ اور بے مثال خزانہ ہے"۔

مسٹر حسن الدین احمد۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ اے۔ ایس لکھتے ہیں:

"جنوبی ہند کی تاریخ عہد وسطی اور انگریزی دور میں جن خطوط، فرامین اور دستاویزات نے تاریخ بنانے کا کام انجام دیا ہے، ان میں اکثر اس خاندان کے ذخیروں میں موجود ہیں۔ مغل سلاطین کے شاہی فرامین و تاریخی دستاویزات کے علاوہ ٹیپو سلطان اور گورنر مدراس کی مراسلت، سلطان محمد عادل شاہ اور سلطان علی عادل شاہ کے فرامین شاہ جی بھونسلہ وغیرہ کے نام، مرہٹہ پیشواؤں کے فارسی فرامین اور مرہٹہ راجہ تنجاور

[1] راقم کو بھی اس عدیم المثال کتب خانہ کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا ہے، جس کے لیے جناب ڈی۔ عبدالرشید لکچرر عربی اور قاضی عبیداللہ صاحب مہتمم کتبخانہ کا شکر گذار ہوں۔ (ض)

کے خطوط و فرامین، آصف جاہ اول کے فرامین، سلاطین آصف جاہی کی مراسلت، مغل سلاطین سے انگریزوں، فرانسیسیوں اور مرہٹہ پیشواؤں، دیگر مرہٹہ راجاؤں، حیدر علی اور ٹیپو سلطان وغیرہ۔ نواب والاجاہ اور کارنوالس، وارن ہیسٹنگز کی مراسلت ایسے نایاب مخطوطے ہیں جن کے منظر عام پہ آنے اور محققین کی توجہ کا مرکز بننے سے ان ادوار کی تاریخ پر نئی روشنی پڑ سکتی ہے.... دکن میں مسلمانوں کی ملی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کی تدوین کے لیے اس کتب خانہ میں بیش بہا اور نادر ریکارڈ اور کتابیں موجود ہیں"[1]

عرب لیگ کلچرل مشن کے صدر شاہ عبد المطلب قاہرہ، بغداد کے ذکریا یوسف وغیرہ نے اس کتب خانہ کو دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا تھا۔ ان حضرات کو نہ یہاں سے کوئی کتاب مستعار مل سکی اور نہ نایاب مخطوطات کی فوٹو کاپی لینے کی اجازت ہی ملی۔ ابھی تک اس کتب خانے کی کوئی باقاعدہ اور ضخیم فہرست شایع نہیں ہو سکی ہے، البتہ اس کی اور کتبخانۂ رحمانیہ مدراس کے اردو مخطوطات کی مختصر فہرست ۱۹۸۹ء میں شایع ہوئی ہے۔

مدراس کے اہل علم کے ذاتی کتب خانوں میں بھی نایاب کتب محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ شہر مدراس میں امیر محل مدراس کا کتب خانہ، مدراس یونیورسٹی کا کتب خانہ اور اردو سمینار کا کتب خانہ اور جمالیہ عربک کالج مدراس کا کتب خانہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔

شمالی آرکاٹ کے کتب خانے (۱) مدرسۂ لطیفیہ عربک کالج ویلور کا کتب خانہ اور مدرسۂ باقیات الصالحات عربک کالج ویلور کا کتب خانہ ہزاروں عربی فارسی

[1] تذکرۂ سعیدہ مرتب پروفیسر ڈاکٹر محمد فضل الدین اقبال ص ۹۷ مطبوعہ ۱۹۷۳ء۔

اور دکنی مخطوطات سے پر ہیں۔ یہاں قدیم ترین عربی فارسی اور دکنی کتب کے جو ذخائر ہیں اب ان کی طباعت کا آغاز ہوا ہے، جامعۂ دار السلام عمر آباد عربک کالج کی عمر لائبریری میں بھی عربی فارسی اردو کتابوں، رسائل اور انگریزی کی ہزاروں کتابیں اور ماہنامے اور روزنامے محفوظ ہیں۔ دراصل یہ کتب خانہ حضرت کاکا محمد ابراہیم صاحب مرحوم کے ذوقِ علم و فن کا نتیجہ ہے جو ۱۳۴۹ھ میں قائم ہوا تھا اور جس کی دیواروں پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ اسی عربک کالج سے علامہ شاکر نائطی نے مصحف نامی ماہنامہ بھی نکالا تھا، شہر آمبور کے کتب خانۂ فلاح ملت میں بھی عربی، فارسی اور اردو کی ہزاروں کتابیں ہیں۔

شہر وانم باڑی تمل ناڈو میں علمی ادبی، تہذیبی ثقافتی اور مذہبی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور اس حیثیت سے اس شہر کی وہی اہمیت ہے جو لکھنؤ کی ہے۔ یہاں کے مولانا خطیب سر احمد حسین نواب امین جنگ بہادر صدر المہام عدالت باب حکومت سرکار عالی، اعلیٰ حضرت حضور نظام، حیدر آباد دکن کو بچپن ہی سے نادر مخطوطات اور قدیم کتب عربی، فارسی و اردو کو جمع کرنے سے شغف رہا ہے اس کی وجہ سے انکا ذاتی کتب خانہ نہایت وسیع ہو گیا تھا جو حیدر آباد دکن میں منتقل ہو گیا۔ آج بھی شہر وانم باڑی کے مختلف کتبخانوں سے اس شہر کے علماء اور ارباب فضل و کمال استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

کیل کرے کیل کرے (جنوبی آرکاٹ تملناڈو) کے مدرسۂ موالی عربک کالج اور مدرسۂ عروسیہ عربک کالج میں عربی، اردو، فارسی اور اردو کے سینکڑوں مخطوطات محفوظ ہیں، یہاں کے کتب خانوں سے عرب، مصر اور دوسرے بیرونی ممالک کے محققین نے استفادہ کیا ہے، یہاں کے عظیم روحانی پیشوا حضرت صدقۃ اللہ کے دستِ مبارک پر ہندوستان کے

شہنشاہ اورنگزیب نے بیعت کی تھی۔ آج بھی جنوبی آرکاٹ کے علمائے کرام کو عربی زبان وادب پر پورا عبور حاصل ہے اور وہ ہیروں کے بڑے تاجر بھی ہیں۔ افضل العلما ڈاکٹر تیسکہ شعیب عالم صاحب ہیرے کے بڑے تاجر اور عربی زبان وادب کے ماہر ہیں، پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی نے انکی عربی دانی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی شخصیت کو ایک عجوبہ قرار دیا ہے۔ ان سے مصر و شام، سعودی عرب وغیرہ کے اہل علم بھی بخوبی واقف ہیں، شمالی آرکاٹ اور مدراس کے کئی مقتدر علمائے کرام سے بھی بلاد عربیہ کے لوگ واقف ہیں۔ انہیں حضرات کی مسلسل کوشش سے عربی مدارس، مساجد اور کتب خانے تمل ناڈو بھر میں قائم ہوئے۔

حواشی

۱؎ مجلہ ثقافۃ الہند فصلیۃ دہلی، المجلد ۴۱، العدد ا سنہ ۱۹۹۰ء ۲؎ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال مطبوعہ سنہ ۱۹۷۹ء ۳؎ مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما " " " " ۴؎ تذکرۂ سعیدیہ، حیدرآباد دکن از افضل الدین، سنہ ۱۹۲۳ء ۵؎ ارمغان شادی نواب خطیب سراحمد حسین۔ از خطیب محمد عبدالرشید، سنہ ۱۹۲۶ء/۱۳۳۶ھ ۶؎ آئینۂ دانم باڑی، از آمنہ حاجی محمد ابراہیم دار اکین انجمن ۱۹۷۰ء ۷؎ امانتی کتبخانۂ خاندان شرف الملک مدراس، از ڈاکٹر محمد غوث و ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، سنہ ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء ۸؎ قاضی جیب اللہ اورینٹل لائبریری، مدراس کے اردو مخطوطات، از ڈاکٹر محمد غوث و ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، سنہ ۱۹۸۹ء ۹؎ کتب خانۂ رحمانیہ مدراس کے اردو مخطوطات، از ڈاکٹر محمد غوث و ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، سنہ ۱۹۸۹ء ۱۰؎ گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری، سنہ ۱۹۳۱ء۔ سنہ ۱۹۳۲ء۔

اخبار علمیہ

انگریزی زبان میں اسلامی علوم و فنون کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے اور خوشی ہے کہ ادھر چند برسوں میں مختلف حلقوں کی جانب سے کئی اچھے رسائل شایع ہوئے، بعض کا تعارف ان سطروں میں کرایا جاچکا ہے، اس سلسلہ میں نیا اضافہ دہلی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز کا مجلہ 'مسلم اینڈ عرب پرسپیکٹیوز' ہے، جناب ظفرالاسلام خاں کے زیر ادارت اس کے نقش اول اور اب نقش ثانی "فلسطین نمبر جزء اول" سے اس کے بہتر مستقبل کے آثار روشن ہیں، معیاری مضامین کے علاوہ دوسرے مستقل اور مفید کالم ہیں اور مضمون نگاروں میں مستشرقین بھی ہیں، ظاہری نفاست نمایاں ہے، رسالانہ قیمت ۱۵۰ روپے ہے اور پتہ ہے دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز، پوسٹ آفس بکس ۹۷۰۱ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔ ایک اور انگریزی رسالہ مفتی زبیر بایات کی ادارت میں جنوبی افریقہ سے شایع ہوا ہے، 'النصیحۃ دی ایڈوائس' نامی یہ مختصر رسالہ آزادولے AZADVILLE جنوبی افریقہ کے مدرسہ عربیہ اسلامیہ کا ترجمان ہے، اس میں خالص مذہبی تحریریں ہیں، جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی علمی و مذہبی بیداری اور دین حق کی تبلیغ واشاعت کی یہ ایک اور مبارک کوشش ہے، رسالہ کی قیمت درج نہیں، پتہ یہ ہے: النصیحۃ، مدرسہ عربیہ اسلامیہ پی او بکس ۹۷۸۶، آزادولے ۱۷۵۰، ساؤتھ افریقہ۔

زبانوں اور بولیوں کی تاریخ، قوموں اور ملکوں کی تاریخ سے کم دلچسپ اور عبرت آموز نہیں،

قرآن مجید کا بھی ارشاد ہے، وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ، گذشتہ ماہ لندن سے دنیا کا پہلا مفصل لسانی اٹلس شایع ہوا، اسکے معلومات و شمولات حد درجہ حیرت انگیز ہیں مثلاً آیندہ صدی میں تین ہزار سے زیادہ زبانیں اور بولیاں ہمیشہ کیلیے خاموش ہو جائیں گی اور دو ہزار سے زیادہ زبانیں فنا کے قریب پہنچ جائیں گی، اسوقت دنیا کی ایک تہائی زبانیں ایسی ہیں جکے بولنے والے ایک ہزار سے بھی کم ہیں، آسٹریلیا میں ۲۰۰ قدیم زبانوں میں ۱۳۲ کے بولنے والے کہیں کہیں اب دس سے کم رہ گئے ہیں، سابق سوویت یونین سے قطع نظر یورپ میں ایک درجن سے زیادہ زبانیں بولنے والے ۱۵ ہزار سے کم ہیں، ان میں جرمنی کی سوروبین (۴۰۰۰) مشرقی فریسین (۱۱۰۰) شمالی فریسین (۱۰۰۰۰) بھی شامل ہیں، شمالی اسکنڈی نیویا کی لیپی زبان کی چار قسموں کو بولنے والوں کی مجموعی تعداد صرف ۵۰۰۰ ہے، جنوبی یونان کی ایک بولی تسوکینین کے بولنے والے صرف ۳۰۰ ہیں، ماہرین علم لغات کا خیال ہے کہ زبان کے معاملہ میں دنیا اب نقطۂ انتہا تک پہنچ چکی ہے، ان کا اندازہ ہے کہ ۱۵ ہزار برس پہلے دنیا میں دس سے پندرہ ہزار تک مختلف زبانیں رائج تھیں اور اوسطاً ہر زبان کے بولنے والے کم از کم ۶۰۰ اشخاص تھے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب دنیا کی آبادی کا تناسب آج کے مقابلہ میں قریباً صفر اعشاریہ صفر صفر دو (۰.۰۰۲) تھا، زبانوں کی اس کثرت اور گوناگونی میں زوال شاید دس ہزار سال پہلے اس وقت شروع ہوا جب ایک منظم زندگی بسر کرنے کی ابتدا ہوئی، ماہرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ماضی میں زبانوں کی عمر تین سو سال سے ایک ہزار تک کی ہوتی تھی، پھر یہ بتدریج فنا کے مرحلوں سے گزر کر کسی نئی زبان کے قالب میں ظاہر ہوتی تھیں، اس کی وجہ سے یہ قیاس عین ممکن ہے کہ ایک لاکھ سال پہلے جب انسان نے ایک دوسرے سے بات چیت کی ضرورت محسوس کی ہوگی اس وقت سے اب تک پانچ لاکھ زبانیں بنتی بگڑتی رہیں، اٹلس میں گذشتہ پانچ سو برسوں میں لسانی ہست و نیست کی داستان کا بڑی دردمندی سے جائزہ لیا گیا ہے

اور یورپ کے ان ماہرین نے اس احساس شرمندگی کو چھپایا بھی نہیں کہ پانچ سو سال پہلے کم از کم سات ہزار زبانیں موجود تھیں لیکن یوروپی استعمار کی وسعت اور اس کے غلبہ و تسلط کے بعد ان میں قریباً پندرہ فیصد زبانیں معدوم ہوگئیں، امریکہ اور آسٹریلیا میں جب یوروپی قدم پہنچے تو اس کے بعد ۱۰۰۰ امریکی زبانیں اور ۳۰۰ آسٹریلیائی زبانیں بالکل فنا ہوگئیں، فنا پذیر زبانوں کے ماہر اور الاسکا یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل کراس نے زبانوں کی بقا و فنا پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ جن بعض زبانوں کو بچوں نے پڑھنا اور سیکھنا بند کر دیا ہے یہ بربادی کے بالکل قریب ہیں، بعض زبانوں کو بچے سیکھتے ہیں لیکن ان کے بولنے والے اب چند ہی ہیں اس لیے ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ان زبانوں کی موت کی گھڑی بھی آجائے گی۔ جن زبانوں کا حال ان کے برعکس ہے وہی نسبتاً محفوظ ہیں، پروفیسر موصوف کا اندازہ ہے کہ اس وقت امریکا کی قدیم زبانوں میں ایک تہائی ایسی ہیں جن کو بچے اب سیکھ نہیں رہے ہیں، ان کے موجودہ بولنے والوں کا آخری فرد جوں ہی ختم ہوگا ان زبانوں کا چراغ بھی گل ہو جائے گا، ماہرین کو زبانوں کی موت کے دکھ کے علاوہ سب سے بڑا غم یہ ہے کہ گفتگو اور تحریر کی ادبی روایات، صرف و نحو کے بہترین قواعد، لغات کے جلو میں افکار اور معاشرتی اقدار اور بے شمار انسانی تہذیبوں اور ثقافتوں کی امانتیں بھی مفقود ہو کر دنیائے دوں کو اور مفلس و قلاش بنادیں گی، اگر ماضی میں استعمار کا غلبہ اور GENOCIDE (نسل کشی) زبانوں کی موت کے مہلک جراثیم تھے تو موجودہ دور میں ٹیلی ویژن کا حملہ، تیسری دنیا میں بڑے بڑے شہروں کی کثرت، اصل وطن و زاد بوم سے بے اعتنائی بلکہ بربادی اور فلسفہ قومیت کی عدم رواداری ایسے قاتل جرثومے ہیں جو اسوقت دنیا کی ۹۰ فیصد زبانوں کی موت کے درپے ہیں۔ حق ہے، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۝

ع۔ص

وفیات

شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی

از ضیاء الدین اصلاحی

شیخ الحدیث مولانا ابوالحسن عبیداللہ رحمانی ۵؍ جنوری کو رحلت فرما گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ o ان کے نام سے میں بچپن ہی میں آشنا ہو گیا تھا، میرے والد مسلکاً اہل حدیث ہیں، وہ جریدۂ اہل حدیث (امرتسر) اور رسالہ محدث اور اس مسلک کے بعض دوسرے رسالوں کے خریدار تھے، محدث مولانا نذیر احمد رحمانیؒ کی ادارت میں دار الحدیث رحمانیہ دہلی سے شایع ہوتا تھا، اس میں فتاویٰ اور مضامین مولانا عبیداللہ رحمانی کے بھی برابر چھپتے تھے، میں ۱۹۴۲ء میں پرائمری درجات میں پڑھتا تھا، اس وقت "محدث" میری سمجھ میں کیا آتا؛ تاہم اسے پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا، ایک روز والد صاحب نے اسے الٹتے پلٹتے دیکھا تو فرمایا کہ "میں تمہیں اسی مدرسہ میں پڑھنے کے لیے بھیجوں گا جہاں سے "محدث" شایع ہوتا ہے"۔ مگر افسوس

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

جس سال میں مدرسۃ الاصلاح کے درجہ چہارم عربی میں پڑھتا تھا اس سال میرے درجہ میں ایک نئے طالب علم داخل ہوئے جن کی طرف ہمارے استاذ مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم بڑا اعتنا کرتے تھے، جب یہ کسی تعطیل کے بعد اپنے گھر سے مدرسہ آتے تو مولانا ان کے والد کی خیریت ضرور دریافت فرماتے، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انکا بڑا احترام کرتے تھے، اس کی وجہ سے میرے دل میں بھی ان کے والد کی عزت و عظمت کا نقش ثبت ہو گیا تھا۔

ہمارے یہ نئے رفیق درس مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے اور ان کے والد محترم کا نام شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی تھا جو خود بہت ممتاز عالم اور سیرۃ البخاری کے مصنف مولانا عبدالسلام مبارکپوریؒ کے صاحبزادے اور ترمذی شریف کی مشہور و مقبول شرح تحفۃ الاحوذی کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نور اللہ مرقدہٗ کے خاص تربیت یافتہ تھے وکفیٰ بہ فخراً۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب چوتھے درجہ کے بعد ہی دوسرے مدارس میں چلے گئے اور میں مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم مکمل کر کے دار المصنفین آ گیا، اس وقت مولانا عبیداللہ رحمانی صاحب مشکوٰۃ المصابیح کی شرح مرعاۃ المفاتیح لکھ رہے تھے، اسی دینی، علمی اور تحقیقی کام کے سلسلے میں وہ کتابیں دیکھنے کے لیے اپنے وطن مبارکپور سے کبھی کبھی دار المصنفین بھی تشریف لاتے تھے، یہیں جب ان سے ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ میں ایک باوقار مگر نہایت خلیق و متواضع عالم و محدث اور بڑے متبع سنت اور صاحب ورع و تقویٰ بزرگ سے مل رہا ہوں۔

مولانا بڑے متبحر عالم تھے، وہ دینی علوم میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے لیکن ان کا خاص میدان فن حدیث تھا جس کے مسائل و مباحث کی تحقیق و تدقیق میں ان کی عمر گزری تھی۔ مجھے بھی صاحب تصانیف محدثین پر کام کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ان سے استفادہ کا موقع ملا، مولانا شمس الحق ڈیانویؒ کی تصنیف عون المعبود شرح سنن ابی داؤد کے بارے میں بعض تحقیق طلب امور کے متعلق خاص طور پر ان سے رہنمائی کا طالب ہوا جس کا ذکر میں نے اپنے ایک مضمون "عون المعبود کا مصنف کون ہے" میں کیا ہے۔

مبارکپور میں میرے لیے کشش کا باعث مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی ذات گرامی بھی ہے، جن کی دعوت پر اکثر وہاں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بھی حضرت شیخ الحدیث

کی خدمت میں حاضری اور استفادہ کا موقع مل جاتا تھا۔

مولانا عبیداللہ صاحب نے فارسی کے علاوہ متوسطات تک کی عربی کتابیں بھی اپنے والد بزرگوار ہی سے پڑھی تھیں لیکن درسیات کی تکمیل دارالحدیث رحمانیہ دہلی ہی میں کی، جس سے فراغت کے بعد ہی ان کی ذہانت و استعداد دیکھ کر شیخ عطاءالرحمٰن صاحب مہتمم نے ان کو دارالحدیث رحمانیہ میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور کر دیا، اور جب تک یہ مدرسہ رہا وہ اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، کئی برس بعد بنارس میں اسی کا ثمنیٰ جامعہ سلفیہ قائم ہوا تو وہ اس کی سرپرستی فرماتے رہے۔

درس و تدریس کے علاوہ تحریر و تصنیف سے بھی انہیں سروکار رہا، اردو اور عربی میں لکھنے پر پوری قدرت تھی، ان کی اردو تحریریں شستہ، پُرمغز اور حشو و زوائد سے پاک ہیں، گو اردو میں کم لکھتے تھے مگر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے وسیع علم و مطالعہ، دقتِ نظر اور استحضار کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ نے آخر عمر میں ضعفِ بصر کی وجہ سے تحفۃ الاحوذی کی تکمیل کے لیے مولانا عبیداللہ صاحب کو اپنا معاون بنا لیا تھا جس سے ان کو بڑا فائدہ ہوا اور ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور غالباً اسی بنا پر انہیں بھی مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھنے کا خیال ہوا ہوگا جو ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ شرح پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکی جس میں بڑا دخل ان کی خرابی صحت، پیری اور دوسرے عوارض کو تھا، ہندوستان میں مشکوٰۃ المصابیح کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا اور یہاں کے اہل علم نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، اردو فارسی اور عربی میں اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، مرعاۃ المفاتیح اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر بہت ممتاز اور قدما کی شرحوں کے ہم پایہ ہے۔

وہ علم و فضل سے زیادہ عمل، اخلاص، للٰہیت، بےنفسی، قناعت، زہد و تقویٰ اور سیرت و کردار کی پختگی میں فائق و برتر تھے، بڑی پاکیزہ، محتاط، سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اپنی عسرت اور پریشانی کسی کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ عجز و انکسار، خاکساری و فروتنی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ انھوں نے اپنا کام شاید ہی کسی سے لیا ہو لیکن دوسروں کی خدمت کرنے میں ان کو لطف ملتا تھا، اپنے مہمانوں کی تکریم و مدارات میں بچھے رہتے تھے، خوردوں سے بھی جس انداز سے پیش آتے تھے اس سے انہیں بڑی شرمندگی ہوتی تھی۔

اپنے مسلک میں پختگی کے باوجود دوسرے مسلک کے لوگوں کو برا بھلا نہ کہتے بلکہ انکے ذی علم اصحاب کے ادب و احترام کا پورا لحاظ رکھتے تھے، دینی حمیت کے باوجود غصہ، برہمی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار نہ کرتے لیکن نرمی اور ملاطفت سے صحیح اور سچی بات کہدیتے، نہ کسی کو ان کی زبان اور ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہوگی اور نہ کسی کی شکایت اور غیبت سے انکی زبان آلودہ ہوئی ہوگی، عصبیت اور فرقہ بندی کے اس دور میں ایسے معتدل اور پختہ سیرت کے اشخاص مشکل سے ملیں گے۔

شرم و حیا کا یہ حال تھا کہ ع برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب۔ سخت گرمی اور خلوت میں بھی ساتر لباس زیب تن رہتا، بڑے نظافت پسند تھے، لباس سادہ مگر صاف پہنتے اور اپنے مکان کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے۔

وہ طبعاً نہایت خاموش اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے، نہ بلا ضرورت بات کرتے اور نہ فضول کاموں میں وقت ضایع کرتے، جلسے جلوس، ہنگاموں اور ہر قسم کی سرگرمیوں سے الگ رہ کر صرف علمی کاموں میں مشغول رہتے، نام و نمود کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا، خودنمائی ظاہرداری اور تکلف و تصنع سے نفرت تھی، کبھی اپنے کو نمایاں اور ممتاز کرنے کا خیال بھی دل میں

نہ آیا ہوگا، اسی لیے عام لوگوں کو ان کے نام سے بھی واقفیت نہیں تھی مگر ہندوستان ہی نہیں اسلامی ملکوں کے خواص کو بھی ان کے علمی کمالات کا اعتراف تھا، ان کے وطن کے ہر فرقہ و مذہب کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جنازے میں آدمیوں کا جم غفیر تھا، دوسرے ضلعوں اور صوبوں کے لوگ بھی آگئے تھے۔

اس قحط الرجال میں ایسے عالم باعمل کا اُٹھ جانا نہ صرف جمعیۃ اہلحدیث بلکہ ملت اسلامیہ کا خسارہ ہے، گو وہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ فن حدیث کی مشکلات میں خصوصاً اب کون رہنمائی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ علم دین اور حدیث نبویؐ کے اس خادم اور اپنے مقبول بندے کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین!!

ڈاکٹر غلام محمد

مشہور صاحب علم و قلم پروفیسر محمد اسلم پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے گرامی نامے مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے انتقال کی اندوہ ناک خبر ملی، ان کا وطن حیدرآباد دکن تھا، وہ جامعہ عثمانیہ کے گریجویٹ تھے، تقسیم کے بعد کراچی تشریف لے گئے اور بالآخر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رہنمائی میں تصوف و سلوک کے مراحل طے کیے اور خود علم و عرفان اور شریعت و طریقت کے جامع ہوگئے، اپنے مرشد عالی مقام سے ان کو والہانہ تعلق تھا، اس کا ثبوت ان کی تصنیف "تذکرۂ سلیمان" اور وہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً حضرت سید صاحبؒ پر وہ لکھتے رہے ہیں، ان سے فرط تعلق کی بنا پر انہیں دارالمصنفین سے بھی عشق تھا اور وہ برابر اس کی بقا و تحفظ کے لیے دعا فرماتے تھے، انہی کی کوشش سے

ان کے ایک مسترشد جناب محمد یحییٰ صاحب نے پاکستان میں معارف کی ترسیل کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

راقم کو ان سے ملاقات کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گزشتہ دس بارہ[12] سال سے مراسلت کا سلسلہ قائم تھا، جس کا باعث بھی حضرت سید صاحبؒ کی ذات گرامی ہوئی۔

۸۳-۱۹۸۲ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر راقم نے بہار اردو اکاڈمی کے سمینار کے لیے سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر ایک مضمون لکھا، اس کے تتمہ میں اس جلد پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں خاص طور پر معجزات کے تعلق سے ایک مشہور عالم و محدث کی ایرادات زیر بحث آئی تھیں، اس پر فرنگی محل کے ایک بزرگ کو کسی قدر ناگواری ہوئی تھی مگر مولانا غلام محمد صاحب نے اسے ملاحظہ فرمانے کے بعد مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا کہ "آپ نے اہل ندوہ اور حضرت سیدی و مولائی کے وابستگان دامن کی جانب سے فرض کفایہ ادا کردیا"۔ میں نے معارف میں مولانا آزاد اور ربوبیت الٰہی اور بابری مسجد کے انہدام پر جو شذرات لکھے ان کی تحسین فرماکر بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔

مرحوم کا علم و مطالعہ وسیع تھا، فلسفہ و تصوف کے علاوہ تفسیر و قرآنیات پر بھی اچھی نظر تھی، اردو بہت سلیس لکھتے اور تحریر ماقل و مادل ہوتی، سچے عالم کی طرح خطا و تقصیر کے اعتراف میں انہیں تامل اور تنقید و اعتراض پر کبیدگی نہیں ہوتی تھی، اپریل ۹۳ء کے معارف میں ان کی کتاب "رموز سورۂ یوسف" کے تبصرے میں اس کی بعض فروگذاشتوں کی جانب توجہ دلائی تو پہلے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے گرامی نامہ میں اس کی تحسین فرمائی پھر خود صاحب تصنیف نے اپنی فروگذاشتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اظہار تشکر فرمایا۔

پروفیسر محمد اسلم کا گرامی نامہ قدرے طویل ہے اس لیے اس کے بعض اقتباسات ہی کی نقل پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

جناب من زید مجدکم   سلام مسنون

... ۱۸ دسمبر کو ہم پر قیامت گزر گئی۔ بزم اشرفؒ کا ایک روشن چراغ بجھ گیا یعنی ہمارے مخدوم و محترم ڈاکٹر غلام محمد صاحب اس روز علی الصبح کراچی میں امراضِ قلب کے ہسپتال میں انتقال فرما گئے، اسی شام ہزاروں عقیدتمندوں نے ان کا جسد خاکی پنجابی سوداگران کے قبرستان مسمّٰی بہ شفیق پورہ میں سپرد خاک کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

گذشتہ ماہ جولائی میں کراچی میں ان کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان دنوں ڈاکٹر سید سلمان ندوی کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، انھوں نے چند احباب کو رات کے کھانے پر مدعو کیا، ان میں میرے علاوہ قبلہ ڈاکٹر غلام محمد مرحوم بھی تھے، تین گھنٹے خوب محفل جمی اسکے بعد سلمان صاحب ہمیں اپنی قیام گاہوں تک پہنچانے گئے۔ دو تین روز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے عشاء سے قبل مجھے اپنے دولت کدہ پر بلایا، نو بجے روہیل کھنڈ سوسائٹی لے گئے۔ ایک مکان کی چھت پر فرش بچھا ہوا تھا۔ اندازاً تیس بتیس ۳۰-۳۲ افراد وہاں موجود تھے، ڈاکٹر صاحب نے نماز کے بعد پون گھنٹے تک ذکر کرایا۔ اس کے بعد کھانے کا اہتمام تھا، میں انکے برابر بیٹھا ہوا تھا، موصوف اپنے دست مبارک سے میری پلیٹ میں بریانی ڈالتے رہے، کھانے کئی قسم کے تھے لیکن انھوں نے مجھے صرف بریانی ہی کھلائی۔ کھانے سے فراغت کے بعد دعا ہوئی اور مرحوم مجھے میری قیام گاہ پر چھوڑنے آئے۔

میں نے اپنی کتاب "سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کا ذوق موسیقی" ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت اقدس میں ارسال کی، انھوں نے کتاب کے مندرجات کی دل کھول کر تعریف

فرمائی اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ ایک زمانے میں انہیں بھی اس موضوع سے دلچسپی رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے گھر میں ہومیوپیتھک مطب چلاتے تھے۔ میں نے ایک روز عرض کیا کہ اس میں کیا راز ہے کہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے کئی خلفاء اور آگے ان کے خلفاء اور مریدین ہومیوپیتھ ہیں۔ کراچی میں حضرت عبدالحئی عارفی بڑے کامیاب ہومیوپیتھ ڈاکٹر تھے۔ مجذوب بھی غالباً اس فن سے واقف تھے۔ کیا حضرت تھانوی نے بھی اس طریقۂ علاج سے استفادہ کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ ہاں ایک بار جب حضرت تھانوی دوا لینے لگے تو حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اس میں نشہ آور اجزا بھی ملائے جاتے ہیں۔ اس پر فرمایا "میاں! ہم اتنے پرہیزگار کہاں ہیں؟" یہ کہتے ہوئے انھوں نے وہ پڑیا منھ میں انڈیل لی۔ خود سید سلیمان ندوی مرحوم کراچی میں حضرت عبدالحئی عارفی کے زیر علاج رہے تھے۔

ڈاکٹر غلام محمد صاحب چھوٹوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ خط کے لفافے پر مرحوم نام کے ساتھ جو القاب لکھتے انہیں پڑھ کر مجھے شرم آجاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سول سیکریٹریٹ کراچی کی مسجد میں خطبۂ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے۔ اکثر پڑھے لکھے لوگ وہیں نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ افسوس کہ میں کراچی جا کر بھی کبھی انکا خطبہ نہ سن سکا۔   والسلام

غم زدہ : محمد اسلم

مولانا کے مسترشد خاص جناب محمد یحییٰ صاحب کی حالت اس حادثہ کی وجہ سے اس قابل نہیں تھی کہ فوراً خط لکھتے۔ یکم جنوری کا لکھا ہوا ان کا والا نامہ ۱۵ جنوری کو ملا، وہ علالت و وفات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں :

"کیا عرض کروں ؟ ایک قیامت گزر گئی ... اس احقر کا تعلق حضرت اقدس سے اٹھارہ برس سے تھا، حضرت والا کی جدائی کے صدمہ کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ ہر آنے والا دن پہلے سے زیادہ غم اور دکھ دے رہا ہے ... میرے درد دل کو آپ یقیناً محسوس فرمائیں گے کیونکہ آپ سے تعارف کا ذریعہ بھی تو شیخ محترم ہی تھے، دفتر پابندی سے نہیں آرہا تھا، آج ذرا ہمت ہوئی ہے تو آپ کو خط لکھ رہا ہوں آپ سے درخواست ہے کہ حضرت اقدس کے لیے خصوصی دعا فرمائیں آمین فقط محمد یحییٰ"

اللہ تعالیٰ اپنے اس صاحب علم و معرفت بندے کو جنت الفردوس نصیب کرے اور اعزہ و متوسلین کے غم کو زائل فرمائے آمین۔

مولانا شاہ عبدالرحیم مجددیؒ

دینی حلقوں میں مولانا عبدالرحیم مجددی صاحب کی وفات کی خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی جائیگی، انکے جدامجد حضرت مولانا شاہ ہدایت علی صاحبؒ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک بڑے شیخ طریقت تھے، جنکی ذات سے جے پور (راجستھان) میں مدتوں رشد و ہدایت کا چراغ روشن رہا، وہ صاحب تصانیف بھی تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا اردو ترجمہ "درالثانی" کے نام سے کیا تھا، انہی کے سایۂ عاطفت میں مولانا عبدالرحیم صاحب کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ مولانا مفتی محمد رضا انصاری مرحوم اور دوسرے علمائے فرنگی محل سے درسیات کی تکمیل کی، سلوک و تصوف کی منزلیں اپنے جد بزرگوار کی رہنمائی میں طے کر کے خود بھی شیخ کامل ہوئے اور جب انکے انتقال کے بعد انکی مسند ارشاد پر متمکن ہوئے تو انکا فیض بہت وسیع اور عام ہوگیا۔

مولانا کی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر ہوئی تھی اور وہ ایک صاحب ورع و تقویٰ بزرگ اور شریعت و طریقت کے جامع شخص تھے مگر ان میں ایجاد و اختراع کی قابلیت بھی تھی اور وہ زمانے

کے حالات و مسائل اور وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں سے بھی واقف تھے، علاوہ ازیں وہ مخلص اور بڑے عملی شخص تھے، انھوں نے اپنے دادا کے کاموں کو وسعت و ترقی بھی دی اور ان میں اضافہ بھی کیا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ جامعۃ الہدایۃ کا قیام ہے، جس کو وہ قدیم و جدید تعلیم اور عصری علوم سائنس اور ٹکنالوجی کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے انھوں نے اپنی اولاد کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کیا۔

دسمبر ۱۹۸۵ء میں مولانا عبدالرحیم صاحب نے جامعۃ الہدایۃ کے افتتاح کی تقریب بڑے اہتمام سے منائی تھی جس کا دعوتنامہ ازراہ کرم مجھے بھی بھیجا تھا، اس موقع پر میں نے جو مقالہ پڑھا تھا اس کی تحسین فرما کر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ ابھی اکتوبر ۱۹۹۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس بھی وہیں ہوا جس کا دعوت نامہ بورڈ اور جامعہ دونوں کیطرف سے جب مجھے ملا تو بہت خوش ہوا کہ اسی بہانے حضرت کی زیارت اور جامعہ کو دوبارہ دیکھنے کا موقع ملے گا مگر عین وقت پر طبیعت خراب ہو جانے سے اجلاس کی شرکت سے محروم رہا جس کا بہت افسوس ہوا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں مولانا بھی علیل ہو گئے، درمیان میں کسی قدر افاقہ بھی ہوا مگر ۵ جنوری کو صبح نو بجے بمبئی ہاسپٹل میں رشد و ہدایت کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا، اور مولانا ہدایت علی صاحب کی مسند اجڑ گئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور عزیزوں اور عقیدتمندوں کو صبر و قرار بخشے۔

مولانا کی زندگی ہی میں ان کی پیری، علالت اور ضعف کی وجہ سے ان کے صاحبزادگان مولانا فضل الرحیم اور مولانا ضیاء الرحیم جامعہ کے کام انجام دینے لگے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہمت و قوت اور اخلاص و استقلال عطا فرمائے تاکہ انکے والد مرحوم کا لگایا ہوا یہ باغ سرسبز و شاداب رہے۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

مولانا ابوالکلام آزاد، ایک مطالعہ از جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸،

قیمت ۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ اسلوب، پوسٹ بکس ۲۱۱۹، کراچی ۱۸۔

کئی مہینے پہلے پاکستان سے جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے چند جدید مطبوعات کا ایک مجموعہ معارف کے لیے ارسال کیا، ان میں چار کتابوں کا تعلق مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے، ایک انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ ہے اور تین مولانا مرحوم کے سوانح سے متعلق ہیں، یہ سب ان کے صد سالہ یوم پیدایش کے موقع پر پاکستان کی آزاد نیشنل کمیٹی کی جانب سے شایع ہوئی تھیں، زیر نظر کتاب میں فاضل مرتب نے مولانا کی شخصیت، مذہب، سیاست، خطابت، فلسفہ، ادب، صحافت اور تعلیم کے ابواب قائم کرکے اہم اہل قلم کی منتخب مطبوعہ تحریروں کو یکجا کیا ہے اور اس طرح مولانا آزاد کی ہشت پہلو شخصیت کے مختلف دلکش رنگوں اور عکسوں کا حسن ایک نظر میں سامنے آجاتا ہے، ۲۳ مضامین کے اس مجموعہ میں خود مرتب کے قلم سے دو مضامین مولانا آزاد کی خطوط نگاری اور شاعری پر ہیں، مولانا آزاد سے ان کا غیر معمولی تعلق اور عقیدت معروف ہے اور یہ ان کی ان تحریروں میں بھی نمایاں ہے مثلاً غبار خاطر کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "... اردو کی پوری تاریخ تصنیف و تالیف میں کوئی کتاب ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جسے غبار خاطر جیسی مقبولیت حاصل ہوئی ہو"۔ کاروان خیال کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ خطوط ادبی، تاریخی اور صدیقین کی محبت اور اخلاص کی ایک

ایسی بے مثال کہانی ہے جو شاید اب کبھی دنیا میں نہ دہرائی جائے گی"۔ غبار خاطر کے متعلق ان کا یہ خیال بجا ہے کہ شروع اور آخر سے چند الفاظ نکال دیئے جائیں "ان پر مکاتیب کا گمان بھی نہیں ہوتا" ان کے خیال میں اس کی حیثیت مجموعہ مکاتیب کی کم اور تحریرات کی زیادہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد از جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۸، قیمت ۲۵ روپے، ناشر: ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان کراچی ۔ ۴۱۔

اس کتاب میں فاضل مرتب نے برہان کے مدیر شہیر مولانا اکبرآبادی مرحوم کی ان تمام تحریروں کو یکجا کر دیا ہے جو مولانا آزاد سے متعلق ہیں، ان میں وہ مفصل خطبہ بھی شامل ہے جو انھوں نے انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ایک مجلس میں پیش کیا تھا، برہان اور دیگر جرائد میں جو تحریریں وقتاً فوقتاً مولانا اکبرآبادی کے قلم سے نکلیں ان کو اور مولانا آزاد کی تصنیفات اور ابوالکلامی لٹریچر پر ان کے تبصروں کو بھی جمع کر دیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد از جناب ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ شاہد، علی گڑھ کالونی، کراچی ۴۱۔

اس کتاب کے مولف ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے اس لحاظ سے وہ اس کتاب کی اشاعت (۱۹۸۶ء) کے وقت مولانا آزاد کے سب سے معمر و بزرگ معتقد تھے، انھوں نے اپنی دید و شنید اور احساسات و تاثرات کو بڑے پُراثر انداز میں بیان کیا ہے، لفظ لفظ سے

ان کی عقیدت مندی نمایاں ہے، مولانا آزاد اور پاکستان کے متعلق بھی ان کی رائے متوازن ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ "کسی عالم دین نے جس کا تعلق جمعیۃ العلما سے ہو، نیشنلسٹ ہو، کانگریسی ہو یا مولانا آزاد کا عقیدت مند ہو، تقسیم ملک کے فیصلہ کے بعد پاکستان کی مخالفت کی نہ اسے نقصان پہنچایا، اس کے برعکس پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان ان لوگوں نے پہونچایا جو تحریک پاکستان میں اعلیٰ مناصب رکھتے تھے وہی اقتدار کی جنگ میں مصروف ہوئے"۔ مولانا آزاد کی تحریروں اور خطبات کے منتخب اقتباسات کے علاوہ اس میں ان کے چار خطبات بھی دیے گئے ہیں جن میں ۴۷ء کی جامع مسجد کی اہم تقریر کے علاوہ ۵۴ء میں پارلیمنٹ میں ان کی وہ یادگار تاریخی تقریر بھی شامل ہے جو شبلی اکیڈمی کو دی جانے والی امداد کے بارے میں پرشوتم داس ٹنڈن کے اعتراض کے جواب میں کی گئی تھی۔

میزان اقبال (فارسی) از جناب پروفیسر محمد منور، ترجمہ ڈاکٹر شہین کامران مقدم صفیاری، متوسط تقطیع بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور، پاکستان۔

کئی سال پہلے علامہ اقبال کے کلام و پیام پر یہ قابل قدر کتاب شایع ہوئی تھی، اب ڈاکٹر شہین کامران صفیاری نے اس کو فارسی قالب عطا کیا ہے، ترجمہ کے ساتھ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں، علامہ اقبال کے کلام و فلسفہ کو اور زبانوں میں منتقل کرنے کے ساتھ مطالعات اقبال کو بھی مختلف زبانوں میں عام کرنے کی یہ کوشش مفید اور قابل تعریف ہے۔

ع۔ص۔